جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و سماجی شعور

RIPHAH
INTERNATIONAL
UNIVERSITY

مقالہ نگار

سیماب

رجسٹریشن نمبر:F22A14G46080

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال

شعبہ اُردو

فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز

رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس، فیصل آباد

اپریل، ۲۰۲۴ء

جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و سماجی شعور

یہ تحقیقی مقالہ ایم فل اُردو کی ڈگری کے تقاضوں کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

مقالہ نگار

سیماب

رجسٹریشن نمبر:F22A14G46080

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال

معاون نگران مقالہ

شعبہ اُردو

فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز

رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس، فیصل آباد

اپریل، ۲۰۲۴ء

بسم الله الرحمن الرحيم

حلف نامہ

میں حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ ہذا بعنوان ''جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و سماجی شعور'' برائے حصولِ سند ایم فِل اُردو خود لکھا ہے جو امکانی حد تک اصل مصادر و مراجع پر مشتمل ہے۔ البتہ تشریح و تفصیل کے لیے ذیلی مآخذ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اور اس مقالہ کی تیاری میں کسی قسم کے سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ نیز اس سے پہلے یہ مقالہ کسی بھی جامعہ میں حصول سند کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ میں اس مقالے کے تمام نتائجِ و تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

سیماب

دستخط-----------------------

رجسٹریشن نمبر:F22A14G46080

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتی ہوں سیماب نے مقالہ ہذا بعنوان "جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و سماجی شعور" برائے حصولِ سند ایم ۔فِل اُردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔اور اس مقالہ کی تیاری میں کسی قسم کے سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ میں اس کے نتائج اور انداز تحریر و تحقیق سے مطمئن ہوں۔ نیز یہ مقالہ کسی اور جامعہ میں حصول سند کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال

پروفیسر (شعبہ اُردو)

رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی فیصل آباد، کیمپس، فیصل آباد

محمد فاروق بیگ

سیکرٹری ریسرچ کمیٹی (شعبہ اُردو)

رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس، فیصل آباد

پیش لفظ

تمام حمد اس خالقِ کائنات کی، جس کی مدد کے بغیر کوئی کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے مقالے کا موضوع "جاوید انور کی نظموں کا سیاسی و سماجی پہلو" اگرچہ میرا اپنا ہی چنیدہ تھا، تاہم اس موضوع پر پہلے کوئی مقالہ موجود نہیں تھا۔ جاوید انور کی ذاتی زندگی، شخصیت اور ان کے شعری سفر سے متعلق معلومات اکٹھی کرنا اور پھر ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش ایک کٹھن راستہ تھا۔ تاہم اللہ کی مدد شامل حال رہی اور یہ سفر خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

زیر نظر مقالہ بنیادی طور پر چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں جاوید انور کے سوانحی حالات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ انکے خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد اور وفات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب دوم میں سیاست اور سیاسی شعور کا مفہوم اور اردو شاعری میں سیاسی روایت کو مختصراََ بیان کرنے کے بعد جاوید انور کی نظموں میں سیاسی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم میں سماج اور سماجی شعور کے ادب اور شاعری پر اثرات بیان کرنے کے بعد جاوید انور کی نظموں کے مختلف سماجی پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس حوالے سے نظموں میں موجود سماجی موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب چہارم میں مختصراََ جاوید انور کے شعری اسلوب کے نمایاں پہلو کی نشان دہی کرنے کے بعد ان کے شعری اسلوب کے حوالے سے ان کے چند قریبی احباب کی آراء شامل کی گئی ہیں۔

مقالے کی تکمیل میں کئی دقتوں کا سامنا رہا لیکن اللہ پاک کی مدد شامل حال رہی۔ جن چند لوگوں نے اس سفر میں میرا ساتھ دیا، ان میں پہلا نام میری نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال کا ہے جن کی رہنمائی سے مجھے تحقیق کے اصول و ضوابط کو سمجھنے اور انھیں لاگو کرنے میں مدد ملی۔ انھوں نے بڑی مہارت اور تجربہ کاری سے اس مقالے کی ابواب بندی کر کے مجھے بھٹکنے سے بچایا علاوہ ازیں تمام ابواب کی تصحیح بھی فرمائی۔ دوسری اہم شخصیت لائل پور کا ایک اہم شعری نام جناب مقصود وفا ہیں، جنھوں نے جاوید انور کے دوست ہونے کی حیثیت سے ان کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے بارے میں معلومات کے حصول میں مدد دی۔ اس کے علاوہ میں اپنے شریکِ حیات عمیر غضنفر کی شکر گزار ہوں جن کا بھرپور تعاون ہر موڑ پر میرے ساتھ تھا۔ ایم فل کے داخلے سے لے کر مقالے کے بارے میں اکٹھی کی جانے والی کتب اور معلومات کے حصول کے لیے مجھے لانے لے جانے تک انھوں نے ہر ذمہ داری ہمیشہ خوش اسلوبی سے نبھائی۔

تحقیق کے میدان میں کوئی بھی کام حرف آخر نہیں ہوتا۔ مقالہ نگار کو محقق ہونے کا دعویٰ بھی ہر گز نہیں کیونکہ انسان کے کام میں کوتاہی کا ہمیشہ احتمال رہتا ہے۔ میری یہ ایک چھوٹی سی طالب علمانہ کاوش ہے میں نے اپنی بساط کے مطابق موضوع کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے اللہ سے دعا گو ہوں کہ مجھے کامیاب فرمائے۔

سیماب

ابواب بندی

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

تفصیل ابواب

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

باب اول

جاوید انور — احوال و آثار

باب اول

جاوید انور—احوال و آثار

نجی کوائف:

انسان نے اپنی ذات اور خیالات کے اظہار کے لیے جو طریقے اپنائے ان میں شاعری ایک مؤثر ذریعہ اظہار ہے۔اردو شاعری ابتدا سے ہی اپنے عہد کی آواز رہی ہے۔ہر عہد کے عصری مسائل اور سیاسی و سماجی حالات کو شاعری میں سمویا جاتا رہا ہے اور شعری اصناف میں نظم اس کی سب سے بڑی نمائندہ ہے۔اکیسویں صدی کے نظم نگاروں میں جاوید انور کا شمار جدید اردو نظم کی معتبر اور نمائندہ آوازوں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق فیصل آباد سے تھا تاہم انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ آسٹریا میں گزارا۔

پیدائش اور خاندان:

جاوید انور ۱۸اپریل ۱۹۵۹ء کو لاہور سنت نگر کے علاقے میں پیدا ہوئے۔سنت نگر میں جاوید انور کے ننھیال رہائش پذیر تھے۔ان کے نانا کا نام عزیز الدین تھا جو امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔پاکستان آنے کے ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں ان کی وفات ہو گئی۔عزیز الدین کی ایک بیٹی کا نام نصیر اختر تھا جو جاوید انور کی والدہ تھیں۔

والد اور والدہ دونوں مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔والدہ جالندھر سے تھیں اور والد شام سنگھ اتاری، امرت سر سے تھے۔جاوید انور کا ددھیالی خاندان بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ان کے دادا کا نام چودھری ظہیر الدین بھٹی تھا۔چودھری ظہیر الدین اپنا بسا بسایا گھر اور جما ہوا کاروبار چھوڑ کر پاکستان آئے اور لاہور میں آباد ہو گئے۔ چودھری ظہیر الدین کی اولاد میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا محمد انور علی تھا۔محمد انور علی نے گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ لاہور سے میٹرک پاس کیا اور خالصہ انجینئرنگ کالج (موجودہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور) سے پانچ سالہ انجینئرنگ کا ڈپلومہ کیا۔ان کی ملازمت کا آغاز اریگیشن کے محکمے میں سب انجینئر کے طور پہ ہوا اور اسی عہدے پہ ریٹائر ہوئے۔

محمد انور علی کی شادی عزیز الدین کی بیٹی نصیر اختر سے ہوئی۔اللہ نے انھیں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں دیں۔ان کے بیٹوں میں جاوید انور، شہزاد انور، شہباز انور، اعجاز انور اور فیاض انور جبکہ بیٹیوں میں شازیہ اور فوزیہ شامل ہیں۔شروع میں محمد انور کی پوسٹنگ تونسہ بیراج میں ہوئی۔تونسہ بیراج کی تعمیر کے دنوں میں وہ وہیں مقیم تھے۔جاوید انور اسی دوران پیدا ہوئے۔تاہم ان کی پیدائش کرشن نگر لاہور ننھیال میں ہوئی۔جلد ہی ان کے والد نے سرگودھا کے ساتھ موضع سکھاں والی میں تبادلہ کروالیا۔جاوید انور اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔پیدائش کے بعد وہ دس سال تک باغبان پورہ داروغہ والا میں اپنی پھپھو کے پاس رہے۔جاوید انور کے والد کی سرکاری ملازمت کا بڑا حصہ سرگودھا میں گزرا اور جاوید انور

کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی وہیں مکمل ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی مذہبی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ ان کی والدہ نصیر اختر ایک سادہ سی مذہبی خاتون تھیں۔ انھیں مذہبی کتابوں اور بزرگانِ دین کی تعلیمات سے خاصا لگاؤ تھا۔ انھوں نے بچپن میں ایسی کئی کتابیں خرید کر جاوید انور کو پڑھائیں۔

جاوید انور کا بچپن سرگودھا کے قریب سکھاں والی شاہین آباد میں گزرا۔ رسمی تعلیم کے لیے وہ گورنمنٹ پرائمری سکول ۱۱۹ چک جنوبی سرگودھا میں داخل ہوئے۔ یہاں سے انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بچپن سے ہی انھیں شاعری سے گہرا شغف تھا اور سکول کے زمانے میں بھی ایک نظم نگاری کے مقابلے میں انھوں نے پہلا انعام حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ ان کی ذہانت کی وجہ سے انھیں بہت پسند کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان جاوید انور نے گورنمنٹ کمپریہنسو ہائی سکول سرگودھا سے پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ایف ایس سی مکمل کرنے کے بعد ایم بی بی ایس کے لیے پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد میں داخل ہو گئے۔

مندرجہ بالا معلومات راقمہ کو جاوید انور کے بھائی محمد فیاض انور نے فراہم کیں۔

میڈیکل کالج کا زمانہ ان کی تعلیمی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کے شعری سفر کی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک متحرک زمانہ ہے۔ ان کے قریبی دوست اور نظم کے عمدہ شاعر ڈاکٹر وحید احمد، میڈیکل کالج میں ان کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ وہ اپنی یادداشتوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ”جاوید انور میرے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ ہم لوگ پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد میں اکٹھے پڑھے ہیں۔ میں ۱۹۷۷ء میں داخل ہوا تھا وہاں اور جاوید ۱۹۷۸ء میں آیا تھا۔ مجھ سے ایک سال جونیئر تھا۔ سرگودھا سے تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگالیں کہ سن ۱۹۷۸ء سے لے کر ان کا انتقال ہوا جب ۲۰۱۰ء میں، تب تک وہ مسلسل میرے رابطے میں تھا۔ میڈیکل کالج میں تو ہم یوں سمجھ لیں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہم انٹر کالجیٹ مشاعروں میں جایا کرتے تھے اور ہم نے پنجاب میڈیکل کالج کو اتنی ٹرافیز لا کر دیں کہ ہمارے پرنسپل کا دفتر ٹرافیوں سے بھر گیا تھا۔ وہ ہمیں ہر ٹرافی پہ انعام دیا کرتے تھے تو ایک طرح سے وہ ہماری کمائی کا ذریعہ بھی تھا۔“(۱)

احوالِ ملازمت:

ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے امتحان پاس کر کے سرکاری ڈاکٹر کی ملازمت حاصل کر لی۔ ان کی سرکاری ملازمت کا آغاز جنرل ہسپتال لاہور سے ہوا۔ جاوید انور نے کچھ عرصہ علامہ اقبال میڈیکل کالج میں بحیثیت ڈیمونسٹریٹر بھی ملازمت کی۔ وہ ایک حساس، فرض شناس اور احساسِ ذمہ داری رکھنے والے میڈیکل آفیسر تھے۔ انھوں نے دورانِ ملازمت ہر ممکن کوشش کی کہ انھیں جو ذمہ داری دی جائے وہ اسے احسن طور پہ انجام دیں۔ گویا ہر لحاظ سے اپنی روزی کو حلال رکھنے کی کوشش کی۔

جاوید انور کی تعیناتی جب لاہور میں "اعوان والا" کے ہیلتھ سینٹر پر ہوئی تو ان دنوں یہ جرائم پیشہ افراد کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ سبھی ڈاکٹر یہاں آنے سے گھبراتے تھے کیونکہ وہاں کا ماحول ایک ایماندار آدمی کے لیے ساز گار نہیں تھا۔ جاوید انور کو جب وہاں تقرری کی اطلاع دی گئی تو وہاں کے ماحول کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا گیا۔

علی اصغر عباس اس حوالے سے اپنی یادداشت کنگھالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

> ”جاوید انور نہایت ہی دیانت دار سرکاری آفیسر کا بیٹا تھا۔ ان کی ایمانداری جاوید کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنے پیشے سے محبت کرتا تھا اور اسے خدمت انسانی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ جاوید انور جب پہلے دن اپنی تعیناتی کے مقام پر گئے تو ان کے خالو چوہدری نصیر جو اس وقت ڈی آئی جی جیل خانہ جات تھے، انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں باوردی پولیس اہلکار جاوید انور کے ساتھ بھیجے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے طبی مرکز پر نمودار ہوئے تو جرائم پیشہ افراد کی سیٹی گم ہو گئی۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ آنے والا ڈاکٹر کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جس سے اپنی مرضی کے مطابق سرٹیفکیٹ لے سکیں گے۔ جاوید کا پہلا تاثر ڈھاب کی طرح ان کے دلوں میں بیٹھ گیا۔“(۲)

جاوید انور چونکہ ایک انسان دوست شخص تھے اس لیے وہ سچ مچ کے مسیحا بن کر لوگوں کی خدمت کرتے رہے۔ لوگوں کو ہر طرح کی طبی سہولیات فراہم کرنا، شہر میں تعینات ڈاکٹروں سے دواؤں کے نمونے اکٹھے کر کے گاؤں کے مریضوں تک پہنچانا اور ضرورت پڑنے پہ اپنی جیب سے دوا کے پیسے دے دینا ان کی انسان دوستی اور دردمند دل ہونے کا ثبوت ہے۔ گویا ایک اچھے شاعر ہونے سے پہلے وہ ایک اچھے انسان بھی تھے، ایک ایسا انسان جو انسانی قدروں کا خیال رکھتے اور اپنی ہر ممکن کوشش کے ذریعے اس معاشرے کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔

جاوید انور کی پوسٹنگ پنجاب کے دور دراز دیہاتوں میں بھی ہوتی رہی جہاں ہر قسم کے حالات میں ان کی بیوی ماریا ان کے ساتھ رہیں۔ ایک بار وہ دونوں کسی قصبے کے بنیادی مرکزِ صحت میں مقیم تھے۔ اس دوران وہاں سیلاب آ گیا۔ چھت پر چارپائی ڈالے دونوں میاں بیوی وہیں رہے اور ڈوبتے گاؤں میں تب تک لوگوں کی دیکھ بھال کرتے رہے جب تک آخری آدمی کو امدادی ٹیموں نے گاؤں سے نکال نہیں لیا۔ اس دوران جاوید انور نے ایک شعر بھی کہا:

اے سیلِ آب ٹھہر، اب کے گردنوں تک رہ   تنوں کی تختیاں دھونی ہیں، بس تنوں تک رہ

جاوید انور کے قریبی دوست حسنین عابد نے ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں مندرجہ بالا معلومات راقمہ کو فراہم کیں۔

دوست اور حلقہ احباب:

جاوید انور کا آبائی گاؤں سرگودھا میں تھا اس لیے ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ سرگودھا میں گزرا اور وہاں کی تمام بڑی علمی و ادبی شخصیات سے ان کی واقفیت اور قربت تھی۔ سرگودھا میں رہنے والے اس دور کے تمام ادبی ناموں سے ان کی گہری شناسائی تھی۔ نوجوانی کے دور میں انھوں نے کچھ عرصہ ڈاکٹر خورشید رضوی سے شعری رہنمائی بھی لی۔ ڈاکٹر

وزیر آغا، غلام گیلانی اصغر،خورشید رضوی اور غلام الثقلین نقوی اور انور سدید کی محفلوں میں انھوں نے بہت وقت گزارااور سیکھا۔ لاہور گئے تو وہاں پاک ٹی ہاؤس اور اس وقت کے اہم مجلہ فنون کا دفتر ان کے مستقل ٹھکانوں میں سے تھے۔ جاوید انور کو احمد ندیم قاسمی اور خالد احمد سے بہت عقیدت تھی۔

جاوید انور کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ان میں ادبی دوستوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل تھے جن کے مشاغل اور شوق ان سے مختلف تھے۔ان کی زندگی کے اختتام تک دوستیوں کا یہ دائرہ گھٹنے کے بجائے مزید بڑھتا اور پھیلتا ہی رہا۔ جب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں لاہور گئے تو وہاں بھی ادب پسندوں کی محافل اور صحبت میں بیٹھتے اور سیکھنے سکھانے کا سفر جاری رہا۔ احمد ندیم قاسمی کے فنون کے دفتر اور مجلس ترقی ادب کے روزانہ کے ملاقاتی تھے اور باقاعدگی سے وہاں جاتے تھے ۔ جاوید انور جن دنوں لاہور میں مقیم تھے تو ان کا دن اپنی ملازمت کے سلسلے میں بی ایچ یو(بیسک ہیلتھ یونٹ) میں گزرتا جو اعوان ڈھائی والا میں تھا اور شامیں پاک ٹی ہاؤس کے ادبی حلقوں میں گزرتیں۔

جاوید انور کے بھائی فیاض انور ان کی شخصیت اور مزاج کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> " جاوید ایک خالص اور مکمل شاعر تھا۔شادی سے پہلے اس کا مزاج اور رویے مکمل شاعرانہ تھے۔لاپرواہی، بے فکری، رات دیر تک جاگتے رہنا، حساسیت، پیسے اور مادی چیزوں سے بے نیازی، زندگی میں آگے بڑھنے اور دوڑ میں شامل ہونے کی چاہ نہ ہونے کے برابر۔ لیکن اپنی شادی کے بعد وہ بہت بدل گیا اور ایک ذمہ دار انسان بن گیا۔ جاوید کا زیادہ تر وقت اپنے دوستوں میں گزرتا تھا۔ سن نوے کے ابتدائی دور میں ابھی موبائل فون ہمارے ہاں نہیں پہنچے تھے، تو اگر ہمیں (گھر والوں کو) اسے کوئی پیغام دینا ہوتا تو ہم شام کو پاک ٹی ہاؤس میں جاتے تھے اور وہ وہیں پہ ملتا تھا۔ وہاں اس کے دوستوں کا ایک مستقل حلقہ تھا جس میں علی اصغر عباس، غافر شہزاد، خالد احمد، نجیب احمد، اور چند اور دوست شامل تھے۔ جاوید انور کے ہم عصر شعرا میں ثاقب ندیم، حسین عابد، مقصود وفا، افتخار بخاری، علی اصغر عباس، سلمان صدیقی، ناہید شاہد اور کئی اہم نام اس کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔" (۳)

ازدواجی زندگی:

جاوید انور نے کالج کے بعد بحیثیت ڈاکٹر لاہور کے مضافات میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ان کی شادی آسٹرین نژاد خاتون ماریا سے ہوئی۔ ان کی شادی بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ اورئینٹل کالج لاہور میں جاوید انور کے ساتھ ایک شام رکھی گئی جہاں انھوں نے اپنا کلام سنایا۔ اس تقریب میں ایک آسٹرین خاتون ماریا بھی موجود تھیں جو اس کالج میں اردو پڑھ رہی تھیں۔ ماریا سیر اور کچھ تعلیمی سرگرمیوں کے لیے پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ وہ جاوید انور کی شخصیت اور

شاعری سے بہت متاثر ہوئیں اور یہیں جاوید انور کی ملاقات ماریا سے ہوئی۔ ایک سال کے اندر اندر اپریل ۱۹۸۸ء میں دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ جاوید انور کی اولاد میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ تاہم ان کی پہلی بیٹی میرا پیدائش کے دس ماہ بعد ہی وفات پا گئی تھی۔ ان کی حالیہ اولاد میں دو بیٹیاں نورما اور ماریا زہرہ ہیں اور ایک بیٹا ہے۔ جاوید انور کی فیملی آسٹریا کے شہر سیلزبرگ میں رہائش پذیر ہے۔ ان کی اہلیہ ماریا اس وقت پچھتر برس کی ہیں اور انگریزی کی استاد ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی نورما تینتیس برس کی ہیں اور اپنے والد کے پیشے سے ہی منسلک ہیں اور بطور ڈاکٹر کام کر رہی ہیں۔ چھوٹی بیٹی ماریا زہرہ اٹھائیس سال کی ہیں۔ ماریا زہرہ نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور آسٹریا کی منسٹری آف انرجی میں بطور پولیٹیکل ایڈوائزر کام کر رہی ہیں۔ ان کے بیٹے کی عمر چودہ سال ہے اور وہ ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

جاوید انور ایک محبت کرنے والے باپ تھے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہ رہے۔ اپنی بچیوں کو سکول لے جاتے، ان کے ساتھ وقت گزارتے اور ان کے لیے پاکستانی اور دیسی کھانے بھی بنایا کرتے۔ بچوں کو عید تہوار پہ تحفے تحائف دیا کرتے اور خصوصاً کتابیں تحفہ دیتے۔ وہ اپنے بچوں کے علاوہ دوسرے غریب اور مستحق بچوں کو بھی کتابیں تحفتاً دیا کرتے تھے۔ مندرجہ بالا معلومات محققہ کو جاوید انور کی بیٹی نورما سے استفسار پہ معلوم ہوئیں۔

پاکستان سے ہجرت:

جاوید انور نے کئی وجوہات کی بنا پر پاکستان چھوڑا۔ معاشی مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ یہاں پہ آمدنی نہایت محدود تھی۔ وہ ایک اچھی آمدنی کمانے والے پرائیوٹ ڈاکٹر نہیں بن سکتے تھے کہ بنیادی طور پہ ایک حساس اور درددل رکھنے والا آدمی تھے۔ غریبوں اور مجبور لوگوں سے اپنی فیس لینا بھی انھیں گوارا نہیں تھا تو ایسے میں کسی پرائیوٹ کلینک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔۔ آسٹریا میں ہمارے ہاں کی نسبت کیریئر کے مواقع زیادہ تھے تو دونوں میاں بیوی نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم مستقل رہائش کے لیے آسٹریا چلے جائیں۔

دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وہ اپنی بڑی بیٹی کی موت کے صدمے سے گزر رہے تھے۔ ان کی بیٹی کی پری میچور پیدائش ہوئی اور وہ کئی ہفتوں تک وینٹی لیٹر پہ پڑی رہی اور ایک ماہ کی ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلی گئی۔ جاوید انور کے لیے یہ صدمہ بڑا شدید تھا۔ انھوں نے اپنی بیٹی میرا، والد صاحب اور مرحوم بھائی کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں جو ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جاوید انور کی دوسری کتاب "اشکوں میں دھنک" کا ایک بڑا حصہ ننھی میرا کی یاد میں لکھی گئی نظموں پر مشتمل ہے۔

۱۹۸۹ء میں اپنی بیٹی میرا کی وفات کے بعد جاوید انور نے پہلی بار آسٹریا سفر کیا، اپنی نوکری سے لمبی چھٹی لی اور ۱۹۹۱ء تک آسٹریا میں رہے۔ ان کی ایم بی بی ایس کی ڈگری آسٹریا میں قابلِ قبول نہیں تھی اور وہ بطور ڈاکٹر کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں وہاں کی زبان پہ بھی دسترس نہیں تھی۔ اگلے چند سال وہ ذہنی طور پہ پریشان رہے اور اپنے مستقل قیام کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکے۔ انھیں کچھ عرصہ دوبارہ واپس پاکستان آنا پڑا۔ اس دوران وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج

لاہور میں بطور ڈیمونسٹریٹر کام کرتے رہے۔ آخر کار ۱۹۹۴ء میں انھوں نے مستقل طور پہ آسٹریا میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ آسٹریا جا کر انھوں نے وہاں کے تمام امتحانات پاس کیا اور بالآخر ایک سال بعد انھیں ڈاکٹر کی ڈگری مل گئی۔ پھر چند سال بعد انھوں نے نفسیات میں ڈپلومہ حاصل کیا اور ذہنی امراض کے ڈاکٹر ماہر نفسیات کے طور پہ کام کرنا شروع کر دیا۔ سیلزبرگ کے سینٹرل ہسپتال میں کام کے دوران انھوں نے نفسیاتی اور ذہنی امراض اور مریضوں کا قریبی مشاہدہ کیا۔ اس مشاہدے کے کئی عکس ان کی نظموں کی آخری کتاب میں نظر آتے ہیں جہاں وہ مختلف ذہنی امراض اور ان مریضوں کی حالت کو نظم کا لبادہ اوڑھاتے ہیں۔ انھیں وہاں مختلف مذاہب، ثقافتوں اور ملکوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، انھوں نے جرمن اور ترکی زبانیں سیکھیں، نفسیات کے موضوع پہ ہونے والی عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی اور مختلف ملکوں سے آنے والے پناہ گزینوں کا علاج کیا۔ انھوں نے کچھ عرصہ جیل کے ان مریضوں کا بھی علاج کیا جنھیں آسٹریا سے ان کے اپنے ملک ڈی پورٹ کرنے کی دھمکی دی جاتی تھی اور وہ ذہنی اذیت کا شکار ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ ایک قابل ماہرِ نفسیات بن گئے۔

جاوید انور کے آسٹریا منتقل ہونے کے فیصلے کے متعلق ان کی اہلیہ سے استفسار پہ راقمہ کو مندرجہ بالا معلومات حاصل ہوئیں۔

آسٹریا جانے کا فیصلہ اگرچہ جاوید انور نے خود کو درپیش حالات کے پیشِ نظر اختیار کیا تھا تاہم اپنے وطن پاکستان سے انھیں بہت لگاؤ تھا۔ ایک حب الوطن شہری کی طرح وہ ملکی حالات پہ کڑھتے بھی تھے اور ان کے اندر کے تخلیق کار کی حساسیت انھیں معاشرتی اور قومی مسائل سے صرفِ نظر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ان کے قریبی دوست اور اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت ڈاکٹر وحید احمد کا کہنا ہے:

> ”جاوید پاکستان کی صورتحال پہ کڑھتا بھی تھا جیسا کہ ایک شاعر اور ایک دانشور کو کڑھنا چاہیے۔ اس پہ بات بھی کرتا تھا، افسوس کا اظہار کرتا تھا۔ آپ دیکھ لیجیے ۱۹۴۷ء سے اب تک ہمارے ساتھ جتنے حادثات ہوئے ہیں، ضیاء الحق کے دور میں ہم اکٹھے تھے۔ ہم نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف کام کیا ہے۔ میں نے بھی اور جاوید انور نے بھی۔ ہم نے لکھا ہے اور ہم نے اس سلسلے میں صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔“(۴)

جاوید انور کو پاکستان کی دیہاتی زندگی بہت پسند تھی۔ پنجابی ثقافت اور پنجابی زبان سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے قریبی احباب بتاتے ہیں کہ وہ عموماً پنجابی میں ہی بات کیا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جب وہ آسٹریا سے واپس آئیں تو گاؤں میں اپنا ذاتی گھر بنائیں گے۔ وہ سال میں کم از کم ایک بار لازمی پاکستان آتے۔ پاکستان سے انھیں بہت محبت تھی۔ جاوید انور کی چھوٹی بیٹی ماریا زہرہ لکھتی ہیں:

> ”میرے والد کے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ ہم اپنی جڑوں سے جڑے رہیں، ہمیں یاد رہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور خود ان کی اپنی پرورش کہاں کس ماحول میں ہوئی تھی۔ اپنی وفات سے پہلے وہ ہمیں خصوصی طور پر پاکستان لائے اور ان تمام جگہوں پہ لے کر گئے جو ان کی زندگی میں اہمیت رکھتی تھیں جیسا کہ اپنے گاؤں جہاں انھوں نے

> اپنا بچپن گزارا، جہاں وہ بڑے ہوئے، وہ میڈیکل کالج جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔اور جب ہم نے پاکستانی ثقافت اور کلچر میں دلچسپی ظاہر کی اور اسے فخر سے دوسروں تک پہنچایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔آسٹریا میں بھی وہ ہمیں پاکستانی لباس، کھانے اور مٹھائی خرید کر دیتے اور تہوار پہ چوڑیاں اور مہندی بھی لا کر دیتے۔"(۵)

انسان جس جگہ آنکھ کھولتا ہے، جہاں اپنے بچپن کے بے فکری بھرے دن گزارتا ہے اور جہاں اپنے شباب کی سیڑھیاں چڑھتا ہے وہ جگہ، وہ ملک، وہ شہر یا گاؤں اس کے لیے ایک خاص انسیت کا حامل ہوتا ہے۔اس کا اپنی جڑوں سے رشتہ ایسا مضبوط ہوتا ہے کہ گردشِ دوراں کبھی اگر اسے ہجرت پہ مجبور کر بھی دیں تو یہ ہجرت ایک بھاری دل سے کیا گیا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔وہ دنیا میں کہیں بھی چلا جائے اپنی مٹی کی کشش اسے اپنی طرف بار بار بلاتی ہے۔جاوید انور کی پاکستان سے آسٹریا منتقلی ان کے حالات کا فیصلہ تھی لیکن یہ حالات انھیں اپنے ملک سے محبت کرنے یا بار بار ان گلیوں کو دیکھنے آنے سے روک نہیں سکے۔

جاوید انور کے دوست اور مشہور شاعر ثاقب ندیم اپنے دوست کی وطن سے ہجرت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اُن دنوں ہمارا محبوب موضوع ملک، ملک کی سالمیت اور ترقی کے ممکنہ پہلو ہوا کرتے تھے۔ہم ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔کوشش بھی کی۔ڈاکٹر نے بھی اپنی سی کوشش کی لیکن نظام کے ہاتھوں سے جو متواتر تنزل کا شکار تھا، دلبرداشتہ ہو کر ڈاکٹر نے ہم سے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ڈاکٹر کی نظم "جدائی کی پہلی نظم" اُن دنوں بہت ہانٹ کرتی تھی۔ اُس نے کہا، "میں نے اپنی سی کوشش کر لی ہے اور ناکام رہا ہوں اور بس اب جا رہا ہوں۔" میں نے کہا، "یہاں لوگ خود کو بدلنا نہیں چاہتے اور معاملات بتا رہے ہیں کہ مستقبل صرف تباہی سے وابستہ ہے۔ خیر! میں کچھ بہتر کرنے اور معاملات کو اپنی حد تک درست کرنے کی اک اور کوشش ضرور کروں گا۔" اُدھر ڈاکٹر نے جانے کا قصد کیا اور ادھر ٹولنٹن مارکیٹ کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ کہا گیا کہ اسے عجائب گھر کی تحویل میں دیا جا رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کے ساتھ کبانہ سے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر جتنے دن بھی کبانہ رہا میں اُدھر نہیں گیا۔ پھر میں نے ایک نظم لکھی جو تھی "جدائی کی دوسری نظم" اور اس نظم میں اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا۔"(۶)

شخصی کوائف اور دلچسپیاں:

ایک اچھا ادیب اور شاعر وہی ہوتا ہے جس کا دل حساس، ظرف بڑا، مطالعہ وسیع اور دنیا کو دیکھنے کا نظر اور نظریہ بھرپور اور ٹھوس ہو۔یہ خصوصیات اس کی شخصیت سے بھی جھلکتی ہیں اور اس کے دوست احباب اور

ملنے ملانے والوں کواس کی انفرادیت کااحساس دلاتی ہیں۔جاوید انور کی شخصیت میں بھی یہ تمام عناصر شامل تھے۔ وہ ایک دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔جب بھی کوئی ضرورت مند انھیں پکارتا وہ انکار نہیں کرپاتے تھے۔ ان سے منسلک ہر شخص ان کی زندگی میں بھی ان کا مداح تھا اور ان کے جانے کے بعد بھی انھیں یاد کرتا ہے۔ ان کے ایک دوست اور شاعر ڈاکٹر ثاقب ندیم صاحب نے ان کے بارے میں ایک مضمون لکھا جس میں ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کی خوب صورتی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”وہ دوستوں سے شدید محبت کرتا تھابلکہ وہ توانسانوں سے محبت کرتا تھا-احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد ایک زمانہ وہ دکھی رہا- ان پہ دو نظمیں بھی لکھیں لیکن اس کا دکھ ختم نہ ہوا- جن دنوں میں میو ہسپتال میں تھاجاوید ہر سال آسٹریا سے آتاتورات کی ڈیوٹی پہ میرے پاس آجاتا--وہ کبھی کسی بھوکے کوکیفے پہ کھاناکھلا دیتاپھر اندر آکے مجھے کہتا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے باہر کیفے پہ بیٹھ گیاتھا- بعد میں کیفے والے مجھے بتادیتے لیکن اس نے کبھی ان باتوں کی تشہیر نہیں کی۔“(۷)

شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے تاہم اسے نکھارنے اور سنوارنے کے لیے مطالعہ اشد ضروری ہے۔ محض شعر کہنے کے قدرتی فن سے ایک اچھاشاعر پیدا نہیں ہوسکتاجب تک کہ وہ اس فن کی نمو کے لیے ریاضت نہ کرے۔اقبال نے کہاتھاکہ:

> ”معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود“

شاعری کے فن میں یہ نمود اچھے مطالعہ اور سیکھنے کی خواہش سے جڑی ہے۔علمی استعداد میں اضافے کے لیے کتابیں بہترین ذریعہ ہیں۔یہ نہ صرف آدمی کے شعور کی تربیت کرتی ہیں بلکہ اسے وسعتِ نظر اور وسیع المشربی بھی عطاکرتی ہیں۔اختلافِ رائے کااحترام کرنا بھی سکھاتی ہیں جو ایسی صفت ہے کہ دورِ حاضر میں مسلسل نایاب ہوتی جارہی ہے۔گویاایک باذوق اور وسیع المطالعہ انسان دنیاکو گھسی پٹی دھندلی عینک کے بجائے ایک نئے زاویے اور شفاف عدسے سے دیکھتاہے۔جاوید انور کو بھی مطالعے سے گہرا شغف تھا۔ان کے مطالعہ کے جنون اور ان کے ذوق کے بارے میں راقمہ کو جاوید انور کے بھائی فیاض انور سے استفسار پہ درج ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

اپنے ایف ایس سی کے دوران ہی جاوید انور کے پاس سنجیدہ اور اعلیٰ ادبی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جسے وہ اپنی ذاتی الماری میں بہت سنبھال کے رکھتے تھے۔حتیٰ کہ ان دنوں میں بھی ان کے پاس اس دور کے بڑے ادبی رسائل موجود ہوتے تھے جن میں "فنون"، "اوراق"، "نقوش" اور "سیپ وغیرہ شامل تھے۔ان کے پاس سید قاسم محمود کی شائع کی ہوئی عالمی بیسٹ سیلنگ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جس میں اردو اور کئی انگریزی کتب کے تراجم بھی شامل تھے۔ان کے کتابی اثاثے میں قرات العین حیدر، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی اور بہت بڑے ادبی نام شامل تھے۔ان کے پاس کئی مشہور ڈائجسٹ بھی ہوتے تھے جن میں سب رنگ،

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ شامل ہیں۔

جاوید انور کے قریبی عزیز، شاعر اور کالم نگار علی اصغر عباس لکھتے ہیں کہ:

> "سول لائن کے ایک کوارٹر میں جاوید کا چھوٹا سا کمرہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی تیاری کے دنوں میں بھی ادبی کتابوں اور رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے ن م راشد جنون کی حد تک پسند تھا۔ راشد کی نظم حسن کوزہ گر اور میرے بھی ہیں کچھ خواب کے علاوہ اسے اس کی اور بھی بہت سی نظمیں ازبر تھیں اور پھر ایک دور میں اس پر اختر حسین جعفری نے جادو کر دیا۔"(۸)

جاوید انور کے دوست اور شاعر افتخار بخاری اپنے دوست کی شخصی خوبیوں کے بارے میں بتاتے ہیں:

> "میں نے جاوید انور کو ایک وسیع المطالعہ دوست کے طور پر پایا، گو وہ اپنے علم کے غیر ضروری اظہار سے ہمیشہ اجتناب کرتا تھا۔ ایک بڑے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ محض شاعری تک محدود نہ ہو بلکہ اسے دیگر اہم علوم پر دسترس نہ سہی ان میں دلچسپی ضرور ہونی چاہیے۔ جاوید انور سائنس، سماجی علوم، دنیا کے حالات و واقعات، نفسیات، تاریخ، فلسفہ اور کائنات کے اسرار میں گہری دلچسپی اور سمجھ رکھتا تھا۔ اس کا مطالعہ ایکسٹینسو extensive بھی تھا اور انٹینسو intensive بھی۔ وہ فطرتاً کم گو تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے مقام و مرتبہ کے ہم زبان میسر کم کم تھے۔ ہم خاص دوستوں کے ساتھ البتہ بڑی جرات مندانہ اور گہری گفتگو ہوتی تھی۔ بڑی حد تک اس کے شعری رویے اس کی شخصیت اور طرزِ عمل میں جھلکتے تھے، خاص طور پر جب وہ اپنے قریبی بے تکلف دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اردو شعرا میں وہ مجید امجد اور اختر حسین جعفری کی شاعری پر اکثر بات کرتا تھا۔ اور بہت مداح تھا۔ پابلو نرودا، اوکتاویو پاز، ایذرا پاؤنڈ اور بہت سے دیگر لاطینی، امریکی اور عربی شعرا کو پڑھتا تھا اور بہت پسند کرتا تھا۔"(۹)

ایک بہترین ادیب یا شاعر وہ ہوتا ہے جسے اپنے فن اور ہنر کا ادراک تو ہو لیکن وہ اس پہ نازاں نہ ہو۔ داد کی خواہش تو ہو لیکن اپنی بے جا تعریف و توصیف کا خواہاں نہ ہو۔ وہ نہ صرف عاجز ہو بلکہ اتنا اعلیٰ ظرف بھی ہو کہ اپنے ہم عصروں یا نئے آنے والوں کو خوش دلی سے راستہ دے بلکہ رستہ آسان کرنے کی کوشش بھی کرے۔ ایک اچھا شاعر ہمیشہ روایتی شاعرانہ جیلسی سے پاک اور فن کا قدردان ہوتا ہے۔

جاوید انور بھی ایک اعلیٰ ظرف کے انسان تھے۔ ان کے ہاں شاعری ایک ایسا فطری عمل تھا جو قدرتی چشمے کی طرح خود بخود پھوٹتا نظر آتا تھا۔ ان کی شاعری میں شعوری کوشش نظر نہیں آتی بلکہ ایک فطری تخلیقی بہاؤ ہے۔ وہ کبھی شاعری زبردستی یعنی کسی جریدے میں ضرور شائع ہونے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا کلام ایسا تھا کہ ان

کے ہم عصریااس دور کے دیگر سینئر شعرا انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اس لیے بہت کم عمری میں ہی وہ فنون جیسے بڑے ادبی رسالے میں چھپنے والا ایک مستقل نام بن گئے۔ ان کے دوست افتخار بخاری کی ان کے بارے میں رائے ہے:

"جاوید انور کے کام میں اتنی جان ہے کہ اسے سراہے بغیر چارہ نہیں اور یوں بھی وہ مقابلہ بازی اور گروہ بندی پر یقین رکھنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے کام کے سب معترف ہیں۔ وہ خود بھی جینوئن شعرا کو تسلیم کرتا تھا اور ان کی شاعری کی تعریف میں کنجوسی نہیں کرتا تھا۔"(۱۰)

جاوید انور نے کے حالاتِ زندگی پہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ایک انسان دوست، حساس اور دردِ دل رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کی نظم بھی ایک پر امن اور انسان دوست معاشرے کا خواب ہے۔ لیکن یہ دردِ دل انسان خود اس دنیا اور دنیاداری کا بوجھ زیادہ دیر سہار نہیں سکا اور محض باون برس گزار کے رخصت ہو گیا۔

وفات:

۲۵ نومبر ۲۰۱۱ء کی دوپہر جاوید انور کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ آناً فاناً انتقال کر گئے۔ ان دنوں وہ پاکستان آئے ہوئے تھے اور لاہور میں موجود تھے۔ ان کے اہلِ خانہ اور دوستوں کے لیے یہ خبر قیامت سے کم نہیں تھی۔ اس روز وہ اپنی اہلیہ سے فون پر بات کر رہے تھے کہ انھوں نے اپنی طبیعت خرابی کا ذکر کیا اور دورانِ گفتگو فون کا کریڈل ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ان کی اہلیہ پہلے انھیں آوازیں دیتی رہیں اور پھر گھبرا کر جاوید انور کے بھائی اعجاز انور کو فون کیا اور ان کی طبیعت خرابی کی اطلاع دی۔ انھیں فوراً ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جاوید انور کی وفات سے ان کے گھر والوں کے علاوہ ان کے دوستوں کے ایک وسیع حلقے کو بھی شدید صدمہ پہنچا۔ ان کی وفات کے منظر کو سرگودھا کے سینئر شاعر اور جاوید انور کے قریبی دوست افتخار فیصل یوں بیان کرتے ہیں:

"جاوید انور کی نظم "مراجعت" اس کی اپنی موت پہ منطبق ہوتی ہے۔ اس کی موت کا منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے اپنی زندگی میں اس نظم میں بیان کیا تھا۔ نظم کچھ یوں ہے:

شام ہو\
عام سی شام ہو\
جس کی حد بندیوں میں قفس بھی ہوں\
اور آشیاں بھی\
ہواؤں کی آہٹ پہ کھلتے دریچے بھی ہوں\
آئینوں میں گھرے ننھے مُنے پرندوں کا رقصِ دمِ واپسیں\
ہر نفس پر بہ پر یورشِ رائیگاں

عام سی شام ہو
لیکن اس شام کے راستے میرے گھر جار کیں
گھر کی دہلیز پر
میری ماں
مسکراتے ہوئے میرے گریاں دنوں کی تھکن چوم لے
شام کی سرحدوں سے مؤذن پکارے
تو سب بھائی بہنوں کی چپ میں مری چپ بھی ہو
شام کی سیج پر باپ کے جسم سے میرے بازو اگیں
جب منڈیروں پہ رکھے دیے جگمگانے لگیں
ٹوٹتے فرش پر میرا بھی عکس ہو
میرا بھی نام ہو
عام سی شام ہو
شام سی شام ہو!

جاوید انور کے جنازے کا منظر بھی ایسا ہی تھا۔ شام تھی۔ بظاہر عام لیکن بہت اداس شام۔ گھر کے صحن میں اس کی چارپائی تھی۔ ارد گرد سب لوگ ، اس کی ماں اور بہن بھائی اکٹھے تھے۔ مؤذن نے اذان دی اور کچھ دیر کے لیے آوازوں کا بین تھم گیا، گھر کے سب لوگ چپ ہو گئے اور اس چپ میں جاوید انور کی چپ بھی شامل تھی۔"(۱۱)

جاوید انور کی وفات پہ ان کے پیاروں اور شاعر دوستوں نے کئی نوحے لکھے، کئی نظمیں کہیں۔ ان میں سے ایک نظم ان کے دوست اور شاعر سلمان صدیقی نے لکھی جو درج ذیل ہے:

جاوید انور کے لیے

شاعر! ترے سرھانے
جو پھول بھی کھلے گا
اس کی خموشیوں سے
تیرا پتہ چلے گا
تیرے بدن کی مٹی
اس کا بدن بنے گی
پت جھڑ کی رونقوں میں
جب تلخ سی اداسی

پتوں پہ خود کو لکھ کے
بکھرا کرے گی پل پل
تو چار سو رہے گا
سمتوں کی چلمنوں سے
ہم بے کسوں کو تک کر
تازہ ہوا کے رخ پر
نظمیں لکھا کرے گا
شاعر! ہمیں جو دکھ ہے
اس دکھ کی بے بسی کا
نوحہ بھی تُو کہے گا (۱۲)

اگرچہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ادب کی سرکاری طور پہ کوئی خاص سرپرستی نہیں کی جاتی تاہم پھر بھی کئی ادب دوست لوگ اور ادارے اپنے طور پر ہر ممکن اپنے شعرا اور ادیبوں کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ ۲۰۲۱ء میں جب جاوید انور کو بچھڑے دس سال ہو گئے تو ان کے عزیز دوست اور نظم نگار ڈاکٹر وحید احمد نے اکادمی ادبیات اسلام آباد میں درخواست کی اور جاوید انور کی یاد میں بہت ہی شاندار تقریب برسی منائی گئی جس میں دنیا بھر کے شاعروں نے آن لائن اور باقی پاکستان کے شہروں سے لوگوں نے شرکت کی۔ جاوید انور کو خراجِ محبت اور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ لاہور اور فیصل آباد میں بھی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔

ادبی کوائف:

اکیسویں صدی اردو نظم کی صدی ہے۔ اس دور میں نظم کے کئی بڑے نام پیدا ہوئے اور اردو شاعری نے کلاسیکیت سے جدیدیت کی طرف رخ پھیرا۔ نظم میں بھی جدید موضوعات و مضامین شامل ہوئے۔ اس سے پہلے انجمن پنجاب کے مشاعروں نے نظم کو پھلنے پھولنے کا موقع تو دیا تھا لیکن اس کا دائرہ نیچرل شاعری سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ فطری مناظر اور ظاہری عوامل کو نظم کا لبادہ پہنایا جاتا لیکن نظم داخلی جذبات کی ترجمانی کا مؤثر ذریعہ نہیں تھی۔ تاہم اکیسویں صدی میں نظم ایک مکمل فرد کی طرح سامنے آئی جو بیک وقت خارجی لوازمات کو بھی سمیٹے ہوئے تھی اور داخلی احساسات کو بھی بیان کرنے کا سلیقہ جانتی تھی۔ ن م راشد، میرا جی اور تصدق حسین خالد نے جدید نظم کی بنیاد رکھی اور اسے فرد کے سیاسی و سماجی مسائل کا آئینہ بنانے کی کوشش کی۔ مجید امجد نے اس کوشش میں مزید رنگ بھرے۔ پھر اردو نظم مزید نکھری اور اب اسے سنوارنے والے کئی ہاتھ منظرِ عام پہ آ گئے۔ انھی میں ایک نام جاوید انور کا ہے جنھوں نے اپنی باون سالہ زندگی میں اردو شاعری خصوصاً نظم کے حوالے سے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی اور خود کو اپنے ہم عصروں اور اپنے سینئر شعرا کے سامنے بھی منوایا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ جاوید انور ایک بڑے نظم نگار تھے۔ ان کی شاعری کے معیارات عالمی سطح کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ بھی عالمی سطح کا ہی تھا۔ شاعری سے لگاؤ سطحی اور وقتی نہیں تھا بلکہ یہ گویا ان کے خون میں دوڑتی تھی۔ وہ اپنے ہم عصروں میں نہایت منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے لیے شاعری مشغلہ نہیں، ایک سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تخلیقی عمل تھا اور یہ بات ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنی مختصر سی زندگی میں انھوں نے ایک بڑا شعری سرمایہ چھوڑا۔

جاوید انور نے زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ تاہم اپنے میڈیکل کالج کے زمانے میں وہ باقاعدگی سے لکھنے لگے تھے۔ شروع میں وہ غزل زیادہ کہتے تھے لیکن ان کا رجحان نظم کی طرف تھا۔ وہ بنیادی طور پہ ایک نظم نگار تھے۔ چنانچہ انھوں نے نظم کی صنف کو اپنایا اور نہایت شاندار نظمیں لکھیں۔ ستر کی دہائی کے آخر میں انھوں نے پنجاب میڈیکل کالج میں باقاعدہ نظم لکھنا شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں وہ ایک نوجوان نظم نگار کے طور پہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ خوش قسمتی سے میڈیکل کالج فیصل آباد میں انھیں جن دوستوں کی صحبت میسر ہوئی وہ سبھی شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ ان میں کچھ سینئر بھی تھے، کچھ ان کے ہم جماعت اور کچھ جونیئر، مگر شعر سے دلچسپی نے ان سب کو ہم عمر بنا دیا تھا۔ افتخار فیصل، وحید احمد، حسین عابد اور ثاقب ندیم ان کے میڈیکل کالج کے اہم دوستوں میں شامل ہیں۔ پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد ان دنوں ادبی نشستوں اور شاعروں کا گویا گڑھ بنا ہوا تھا۔ ان میں سے بہت سے نام ایسے ہیں جنھوں نے آگے چل کر اردو شاعری کا دامن نئے اور جدید خیالات کے اظہار سے بھر دیا۔ جاوید انور کے دوست اور شاعر حسین عابد اپنے ایک مضمون "سمندر مرے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" میں لکھتے ہیں:

> "اس زمانے میں پنجاب میڈیکل کالج میں اتنے زرخیز تخلیقی ذہن جمع تھے جتنے شاید ادب وفن کی کسی درس گاہ میں بھی نہ رہے ہوں۔ شاعر، ادیب، موسیقار، مصور، سنگ تراش، آوارہ گرد، فلسفی۔ ہاسٹل کے شب و روز اس وقت کے فوجی آمر جنرل ضیاالحق کے خلاف انقلاب کے منصوبے بناتے، احتجاجی جلوس نکالتے، مخالف سیاسی جماعتوں سے دوبدو جنگیں لڑتے، فیض کی شاعری پر سر دُھنتے، قرات العین حیدر، ہرمین ہیسے، کافکا اور سارتر پر بحثیں کرتے اور جگت بازی کی نا مختتم محفلوں میں گزرتے۔ اس کے مریضوں، دوائیوں، لواحقین اور طلبہ و طالبات میں بکھرے دنوں کی شام دوستوں میں ہوتی تھی۔ اس کے قہقہوں اور چبھتے جملوں سے بڑے بڑے علامہ ان پر کے رہتے تھے۔ اسے جاننے، اپنے فہم کو کشادہ کرنے اور دل کو تازہ رکھنے کی لگن تھی۔ اس دوران اسے شاعری کے "اینگری ینگ مین" کا خطاب ملا۔ وہ کھلے دل والا، یاروں کا یار اور محبتی آدمی تھا اور اپنی جیب اور جذبے کو ایک طرح بانٹتا تھا۔ وہ اپنی تنخواہ سے دوائیاں خرید کر سرکاری ہسپتال میں رکھتا تھا اور چوک میں کھڑے ہو کر منافق ادیبوں پر آوازے کستا

تھا۔ وہ لاہور کے پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو بحثوں میں شدت آجاتی، آوازیں بلند ہوتی ہوئی جھگڑے میں بدل جاتیں۔ رات ڈھلے وہاں سے نکلتا تو وہ کسی کو منا رہا ہوتا یا کوئی اسے منا رہا ہوتا۔ اس کے غصے سے سب ڈرتے تھے۔ اس کی شاعری سے سب مرعوب تھے۔ نوجوان اس کے اسلوب کی نقل میں بے عقل ہو رہے تھے۔"(۱۳)

جدید نظم کے اعلیٰ ترین شعرا کی فہرست میں جاوید انور ایک تابناک نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم پڑھنے والے لوگ اس بات کو جانتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ایک مسلمہ نظم نگار تھے۔ ان کے معاصر نظم نگاروں میں اور ان کے بعد آنے والے نظم نگاروں کے ہاں ان کی شاعری کے اثرات بڑے واضح ہیں۔

جاوید انور مرحوم کی تخلیقات میں کل چار شعری مجموعے ہیں جن میں سے تین مجموعے "شہر میں شام (۱۹۹۱ء)"، "اشکوں میں دھنک (۱۹۹۴ء)"، "بھیڑیے سوئے نہیں (۲۰۰۹ء)" ان کی زندگی میں شائع ہوئے اور چوتھا شعری مجموعہ "برزخ کے پھول" ان کی وفات کے بعد ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔

جاوید انور کی نظموں میں معاشرتی حالات کے جبر سے پیدا ہونے والی گھٹن، طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں انسانوں کی کم حیثیتی اور بے بسی، جدید انسان کی تنہائی اور سیاسی و تاریخی سانحات کے الم ناک نتائج کا نوحہ جابجا نظر آتا ہے۔ ان کی کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ شہر میں شام:

جاوید انور کا پہلا مجموعہ کلام "شہر میں شام" ہے۔ کتاب کا نام جاوید انور کی اپنی ہی ایک نظم "مجھے شام آئی ہے شہر میں" کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور سے شائع ہوئی اور اس کے ناشر طاہر اسلم گورا ہیں۔ یہ کتاب کل ۱۳۶ صفحات پہ مشتمل ہے۔ کتاب میں ۳۳ نظمیں، ۱۸ غزلیں اور ۸ فردیات شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب جاوید انور نے اپنے اہلِ خانہ کے نام کیا ہے۔ "امی جان، ابو جان، ماریا، میرا اور نورما کے نام۔"

اس کتاب کے پیش لفظ میں جاوید انور لکھتے ہیں کہ

"میں زندگی کو نظم کرنے کا قائل ہوں۔"

ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے اور کتاب میں شامل نظموں کے موضوعات اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے زندگی اور اس کے مضافات سے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کو نظم کا پیراہن پہنایا ہے۔ اس کتاب میں " بولتا کیوں نہیں، نوزائیدہ سے خطاب، نیا تماشا، فلسطینی جلاوطن کا گیت، کس حبس کا موسم ہے، چھبیسویں سالگرہ پہ طویل خود کلامی اور ایک مصلوب آواز" جیسی جاندار نظمیں شامل ہیں۔

ان نظموں میں سیاسی حوالے بھی ہیں اور سماجی مسائل بھی۔ جلاوطنی اور بے گھری کا دکھ بھی ہے اور اظہار کی آزادی چھن جانے کا غم بھی۔ حبس اور غلامی کی فضا کی گھٹن میں سانس لینے کی دشواری اور انفرادی زندگی میں اس کے اثرات کا ماتم بھی موجود ہے۔ غرض یہ کہ "شہر میں شام"، جاوید انور کی مزاحمتی شاعری سے بھرپور کتاب ہے۔

۲۔ اشکوں میں دھنک:

"اشکوں میں دھنک" جاوید انور کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی اور یہ کل ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام انھوں نے اپنی نظم "اشکوں میں دھنک" کے عنوان کی مناسبت سے رکھا ہے۔ کتاب میں ۳۷ نظمیں، ۴ غزلیں اور ۲ متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاوید انور کا رجحان اس دوران مکمل طور پہ غزل سے نظم کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس کتاب کا انتساب مشہور شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے نام ہے جن سے جاوید انور کو بہت محبت اور عقیدت تھی۔ انھوں نے قاسمی صاحب کے لیے بہت سی نظمیں بھی لکھیں۔ مجموعہ میں شامل نظم "اے شجر تیرے لیے" جاوید انور کی احمد ندیم قاسمی سے گہری عقیدت کا اظہار ہے۔

اس مجموعہ میں سات نظمیں جاوید انور نے اپنی بیٹی میرا کے لیے لکھیں جو اپنی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد انتقال کر گئی تھی۔

جاوید انور کی مشہور سگنیچر نظم "ہم کہ ہیرو نہیں" بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔ اس نظم میں بہت سی سیاسی تلمیحات ہیں۔ نظم میں عام آدمی کی طرف سے ایک بغاوت کا عنصر شامل ہے اور مختلف مذاہب، نظریات اور بڑے بڑے مشاہیر کے حوالے سے تشبیہات اور استعارے آتے ہیں۔ یہ نظم جاوید انور کی نمائندہ نظم ہے جس کا موازنہ عالمی سطح کی بہترین شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ بھیڑیے سوئے نہیں:

یہ جاوید انور کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پہ آیا۔ اس کے ناشر قوسین پبلشرز لاہور ہیں اور یہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے انتساب کی جگہ جاوید انور نے نظم کی تین سطریں لکھی ہیں۔ یہ نظم مشہور ادیب و شاعر اوکتاوئیو پاز کی ہے اور اس کا ترجمہ جاوید انور نے خود کیا ہے۔

اس مجموعہ کا نام گویا ایک علامتی اظہار ہے۔ یہ ایک خطرے کی تنبیہ کے طور پہ استعمال کیا گیا ہے کہ خطرے ٹلے نہیں بلکہ دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ خطرات انسان کو انسان سے ہی لاحق ہیں۔ ان انسانوں سے جو بھیڑیوں جیسی صفات رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں عالمی سامراجی طاقتوں کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار باقی کتابوں کی نسبت زیادہ ہے۔ جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی ان دنوں بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جا رہا تھا اور ہر تباہی و بربادی کا ملبہ ان پہ ڈال کر ان کے خلاف گویا عالمی مہم شروع کر دی گئی تھی۔ بظاہر انسان دوستی کا دعویٰ کرنے والی بڑی طاقتیں تیسری دنیا کے ممالک کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوئے نسل کشی کی مہم پہ تھیں اور اس کھیل میں خود مظلوم کو ظالم بنا کر پیش کرنے کا پروپیگنڈا بھی شامل تھا۔ جاوید انور ملکی اور عالمی سیاست پہ گہری نظر رکھتے تھے اور اس بات کا ثبوت اس مجموعے میں شامل ان کی نظمیں ہیں جو چیخ چیخ کر بھیڑیوں کے چہروں سے مکھوٹے اتار کر ان کا اصل روپ دکھانا چاہتی ہیں۔

جاوید انور کا یہ مجموعہ کلام مغربی شعریات سے بھی متاثر ہے۔ اس مجموعے میں بہت سی نظمیں مغربی شاعری سے متاثر، ماخوذ یا ان کا ترجمہ ہیں۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی ادب خصوصاً شاعری پہ ان کی گرفت مضبوط تھی اور

انھیں اس میں کافی دلچسپی تھی۔ اس شعری مجموعے میں مغربی شعرا کی ترجمہ کی گئی نظمیں بھی شامل ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاوید انور کا مطالعہ اور عالمی ادب پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

۴۔ برزخ کے پھول:

یہ جاوید انور کا چوتھا اور آخری شعری مجموعہ ہے جو ان کی وفات کے تقریباً پانچ سال بعد شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۰۱۶ء میں القا پبلشرز لاہور سے شائع ہوا اور ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ۳۸ نظمیں، ۳ غزلیں اور ایک فرد شامل ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی مغربی شعرا کے تراجم شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ایک طویل نظم برزخ کے پھول عرف شیزوفرینیا بھی شامل ہے جو جاوید انور کے بطور ماہرِ نفسیات کیے گئے مشاہدات کی ایک لفظی تصویر ہے۔ اردو شاعری میں نفسیاتی مسائل کا یہ بیان ان کی شاعری بلکہ اردو شاعری کا ہی ایک نیا پہلو ہے۔

۵۔ قہقہہ انسان نے ایجاد کیا:

جاوید انور نے شعری دنیا میں ایک نئے تخلیقی تجربے کی بنیاد بھی رکھی۔ انھوں نے اپنے دو شاعر دوستوں کے ساتھ مل کر مشترکہ نظموں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب جاوید انور کے ساتھ ساتھ حسین عابد اور مسعود قمر کی بھی ملکیت ہے کیوں کہ اس میں شامل نظمیں تینوں دوستوں کی مشترکہ تخلیق ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں بک ہوم لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں ۸۰ نظمیں شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر وحید احمد از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۳ء، وقت پانچ بجے شام

۲۔ سیف الرحمٰن: "جاوید انور: فن اور شخصیت" (مقالہ غیر مطبوعہ) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۳

۳۔ فیاض انور برادر جاوید انور، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۴ نومبر ۲۰۲۳ء، وقت اڑھائی بجے دوپہر

۴۔ ڈاکٹر وحید احمد، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۳ء، وقت پانچ بجے شام

۵۔ ماریا زہرہ دختر جاوید انور، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۵ نومبر ۲۰۲۳ء، وقت ۷:۱۳ بجے رات

۶۔ ثاقب ندیم: (مضمون) "سمندر ترے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" غیر مطبوعہ

۷۔ ایضاً

۸۔ علی اصغر: (مضمون) "میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں" مشمولہ "خواب زار" اخبار، روزنامہ دن، س ن، ص ۲

۹۔ افتخار بخاری از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۸ نومبر ۲۰۲۳ء، وقت پانچ بجے شام

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ افتخار فیصل از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۲۹ اکتوبر ۲۰۲۳ء، وقت آٹھ بجے رات

۱۲۔ سلمان صدیقی: "جو نہ بجھ سکے" تفصیلات ندارد، ص ۱۴۴، ۱۴۵

۱۳۔ حسین عابد از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۳ء، وقت پانچ بجے شام

باب دوم

جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و تاریخی شعور

باب دوم

جاوید انور کی نظموں میں سیاسی و تاریخی شعور

سیاست اور سیاسی شعور (معنیٰ و مفہوم)

کسی معاشرے کی تشکیل اور اس معاشرے میں کاروبارِ زندگی چلانے کے لیے انسان جب تگ و دو کرتا ہے تو وہ اس کے لیے اصول و ضوابط قائم کرنے کی کوشش بھی کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے سیاست کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر اس معاشرے کے نظم و نسق کو چلانے اور اصول و ضوابط کے نفاذ کے لیے ایک حکومت قائم کی جاتی ہے۔ اس کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششیں اور پھر حکومت قائم کرنے کے بعد ملکی انتظام و انصرام چلانے کی جدوجہد سیاست کہلاتی ہے۔

سیاست عربی زبان کا لفظ اور اسم مؤنث ہے۔ فرہنگ تلفظ میں سیاست کے معنیٰ:

"حکمرانی، حکمتِ عملی، ملکی امور، مصلحت اندیشی، حصولِ اقتدار اور تحفظِ مفادات کے لیے جدوجہد ہے۔"(۱)

جان ایچ ول سیاست کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"سیاسی نظریہ اور سیاسی فلسفہ انسان اور انسانی معاشرے کے لیے خیر اور صلح کے نظام کے اصولوں کے مطالعے سے عبارت ہے۔ انسان محض زندہ رہنے کے لیے ہی زندہ نہیں رہتا بلکہ وہ اچھی زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور یہی فطرت کا خاصہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے وجود اور اپنے اعمال کا جواز تلاش کرتا ہے۔ انسان نہ صرف اس کا شعور رکھتا ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ اس کا کہ اسے کیا ہونا چاہیے اور وہ کیا ہو سکتا ہے۔ اخلاقیات کے ذریعے وہ عقلی طور پر اس خیر کی ماہیت کو متعین کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ طلب گار ہے۔ سیاسیات میں وہ اسی خیر کو سماجی زندگی میں روبہ عمل لانا چاہتا ہے، خواہ اس کوشش میں اسے اپنے آپ کو یا دوسرے کے ہاتھوں کتنی ہی ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس خیر کو روبہ عمل لانے میں مدد دینا فلسفہ سیاست کا اہم ترین مقصد ہے۔"(۲)

ہر دور کی کچھ خاص روایات و اقدار اور رجحانات ہوتے ہیں جسے اس دور کا عصری شعور کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں اس دور کی عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس خاص عصری شعور میں اس دور کے ادیب و شعرا کی فکر اور نظریات ان کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ کسی ملک میں جو سیاسی و سماجی حالات ہوتے ہیں، ان کا اتار چڑھاؤ وہاں کے ادب میں بھی جھلکتا ہے۔ سیاست زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے، لہٰذا ادب اس سے کیونکر الگ رہ سکتا ہے۔ ادب انسان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ عوام میں صحیح غلط کی پہچان اور کھوٹے کھرے کی تمیز پیدا کرنے کے لیے ادب

ایک اہم وسیلہ ہے تاکہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ وہ کس طرح اپنا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لیے آواز اٹھا سکتے ہیں۔

ادب اور سیاست کا تعلق:

ادب کا تعلق زندگی اور زندگی کی تمام جہتوں سے ہے۔ وہ اپنے عہد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا ترجمان بنتا ہے۔ اس لیے بظاہر سیاست اور ادب کے الفاظ ایک دوسرے سے کوئی قربت رکھتے محسوس نہیں ہوتے مگر ان کا ایک دوسرے سے اٹوٹ بندھن ہے۔ کسی ملک کے انتظام و انصرام اور اقتدار کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں اور حکومت چلانے کو سیاست کہا جاتا ہے۔ ایک ادیب یا شاعر انسان ہونے کے ناطے اور پھر خاص حساس فطرت رکھنے کی وجہ سے اپنے ماحول اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اثرات کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیاست سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ ہر عہد کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے عہد کی تبدیلیوں اور نشیب و فراز کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور اسے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔ اس لیے جب بھی ہم کسی خاص دور کی تخلیقات کا جائزہ لیں تو اس عہد کے سیاسی رجحانات اور واقعات کا ذکر یا عکس ہمیں ان میں ضرور ملتا ہے۔ ادب اور سیاست کے تعلق کے ضمن میں ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> ”زندگی اقتصادیات سے وابستہ ہے اور اقتصادیات اور سیاست دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ زندگی کی ضرورتیں حکومت کے انتظام اور طرزِ سیاست پر مبنی ہیں۔ ان کی خوبی و خرابی سے زندگی بنتی اور بگڑتی ہے۔ جب زندگی کا حکومت سے اتنا گہرا تعلق ہے اور زندگی کا ادب سے اتنا ناگزیر رشتہ ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ بغیر سیاسی نظریہ یا سیاسی تنقید کے ادب کو وہ سرمایہ حیات عطا کیا جا سکے جو کو زندگی کی ترجمانی کہتے ہیں، جس کے بغیر ادب، ادب ہو نہیں سکتا۔“(۳)

سیاست میں عملاً شریک نہ ہونے کے باوجود ہر فرد کسی نہ کسی صورت سیاست سے وابستہ ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا سیاست سے ذہنی اور جذباتی تعلق رکھنا، یا سیاسی رائے رکھنا بہت معمول کی بات ہے۔ سیاسی اور تاریخی انقلاب کا شعور ایک شاعر یا ادیب کو صحیح معنوں میں ادب اور زندگی کے تعلق کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب ادب اور ادیب میں سیاست کے ادب سے تعلق کو ایک سادہ جملے میں یوں واضح کیا ہے:

> ”جو لوگ ادب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں وہ یا تو سیاست کو زندگی سے علیحدہ سمجھتے ہیں یا ادب کو زندگی کا ترجمان نہیں سمجھتے۔“(۴)

پاکستانی شعراء کے ہاں سیاسی شعور:

ایک شاعر و ادیب اپنی فطری حساسیت کی وجہ سے سماجی اور سیاسی بدلاؤ کے گہرے اثرات قبول کرتا ہے۔ تہذیبی شکست و ریخت، ملکی و قومی مسائل، بین الاقوامی سیاست و مداخلت اور اس قسم کے حالات اس ادیب یا شاعر کی فکری سطح کی

تشکیل میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔اسی لیے جنگ کے دور کی نظمیں امن کے دنوں کے گیتوں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔کیونکہ دونوں ادوار میں فرد کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی کشمکش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ایک دور کا انتشار، انارکی، خوف اور تنہائی اور دوسرے دور کی آسودگی اور طمانیت کسی صورت ایک جیسا سخن تخلیق نہیں کر سکتے۔تاہم جنگ صرف ہتھیاروں کے استعمال سے تباہ ہونے والے علاقوں میں ہی برپا نہیں بلکہ کئی بظاہر پر امن نظر آنے والے خطے مسلسل حالتِ جنگ میں ہیں۔بد قسمتی سے وطن عزیز پاکستان بھی اپنی پیدائش کے پہلے دن سے اب تک مسلسل اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔اپنی چھہتر سالہ زندگی میں دو بڑی جنگیں لڑنے، اپنا ایک بازو کٹوانے اور تین طویل مارشل لا بھگتانے والا ملک اپنی بقا کی جنگ جس خستہ حالی میں لڑ رہا ہے، یہ اس ملک کے ہر باسی کی فکری سطح بلند کرنے اور اسے سیاسی شعور دینے کے لیے کافی ہے۔

یوں تو حالات ہر دور میں ہی مشکل اور آسان دونوں رہے ہیں۔انسان کے لیے زندگی پھولوں کی سیج کبھی نہیں ہو سکتی۔تاہم اردو شاعری کی ابتدا میں ہمیں مزاحمتی شاعری کا رجحان کم ملتا ہے۔اس کے برعکس شاعری کو ایک راہِ فرار کی طرح اپنانے کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔تاہم شعر و ادب کے افق پہ صرف وہی نام زندہ رہے ہیں جنھوں نے اپنے سخن کو زندگی کے حقائق کے ساتھ جوڑا اور آفاقی سطح کے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

دورِ جدید کا شاعر و ادیب وہ درباری نہیں جس کا کام آقا کی شان میں قلابے ملانا اور اس کے عوض وظائف پانا تھا۔ بلکہ اب ادیب اور شاعر وہ آزاد فرد ہے جو اپنی پوری عقل و دانش سے حالات کا جائزہ لیتا ہے اور اندھی تقلید کے بجائے خود غور و فکر کر کے اپنے نظریات بناتا ہے، پھر ان کے لیے آزادی اظہار رائے بھی طلب کرتا ہے۔دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے کے بجائے چپو چلا کر اپنے لیے راستہ نکالتا ہے خواہ وہ راستہ بہاؤ کی مخالف سمت کیوں نہ ہو۔

پاکستانی سیاست پر ایک نظر:

برِ صغیر کی تقسیم کے ساتھ دو ملک آزاد تو ہو گئے لیکن فسادات کی آگ نے انسانی خون کی ارزانی اور انسانی جان کی بے حرمتی جیسے بڑے انسانی المیوں کو بھی جنم دیا۔پاکستان بننے کے کئی سال بعد تک ہجرت اور فسادات اردو شاعری کا موضوع رہے۔پھر نئے ملک کے قیام کے بعد اس کے انتظامی مسائل در پیش آئے۔سیاسی بدامنی، افراتفری اور انتظامی وسائل کی کمی نے ایک انارکی کی صورت حال پیدا کر دی۔جس خواب کی تعبیر کے لیے لوگوں نے ڈھیروں قربانیاں دی تھیں، جس آزادی کی تلاش میں وہ ہجرت کر کے آئے تھے، وہ کہیں اپنی تکمیلی شکل میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ایسے میں کئی اداس اور احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں، کئی قلم نوحہ کناں ہوئے کہ

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (فیض احمد فیض)

ابھی اس غیر مستحکم سیاسی و ملکی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کی جا رہی تھی کہ ۱۹۵۸ء میں ملک میں پہلا مارشل لاء لگ گیا۔مارشل لاء کہنے کو تو ملک کی سیاسی و سماجی صورتحال بہتر کرنے کو تھا لیکن اس نے مزید ابتر حالات پیدا

کر دیے۔ سیاسی اور فکری سطح پہ گھٹن اور جبر کا ماحول پیدا ہو گیا، لوگوں سے ان کی رائے کے اظہار کی آزادی چھین کر انھیں ظاہری و باطنی طور پر فرسٹریٹڈ کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں علامتی اظہار اور ابہام کو فروغ ملا۔ شاعروں اور ادیبوں سے بات کہنے کا حق چھنا تو پس پردہ بات کہنے کا ہنر پیدا ہوا۔ مارشل لاء کے خوف اور تشدد نے معاشرے میں ایک گھٹا گھٹا احتجاج بھی پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔

پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ آ گئی۔ اس جنگ نے بکھری ہوئی عوام کو پہلی بار یکجا کیا اور لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنی اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق ملک کو بچانے میں اپنا حصہ شامل کریں۔ حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہوا، پاکستانیوں نے اپنے اپنے سیاسی نظریات اور اختلافات کو پس پشت ڈال کر دفاعِ پاکستان میں حصہ لیا۔ شاعروں نے ترانے لکھے، گلوکاروں نے گیت گائے اور پوری قوم کے جذبے کو ابھارا گیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ جیتنے کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان کے صدر ایوب خان اور بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جو معاہدہ تاشقند کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کا نقصان یہ ہوا کہ سرحد پہ جیتی ہوئی جنگ مذاکرات کی میز پر ہار دی۔ اس معاہدہ میں کشمیر کا فیصلہ شامل نہ کرنے کی وجہ سے صدر ایوب کے خلاف عوام میں غم و غصہ پھیل گیا۔

۱۹۶۷ء میں مارشل لاء کے خلاف عوامی تحریک چلی اور لوگوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں اپنے لیے ایک نئی امید ڈھونڈ لی۔ یہ تحریک بہت زور دار تھی لیکن کچھ سیاست دانوں کی نااہلی اور مفاد پرستی نے اسے ایک نئے مارشل لاء تک پہنچا دیا۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان الگ ہوا اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے المیے نے مشرقی پاکستان کو ایک نئے ملک بنگال کی صورت میں الگ کر دیا۔ یہ سانحہ نوزائیدہ پاکستان کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

۱۹۷۷ میں جاگیرداروں، سرمایہ داروں، کرپٹ سیاست دانوں اور فوجی بیوروکریسی کی ساز باز سے ملک میں تیسرا مارشل لاء لگ گیا۔ ۹۰ دن کے انتخابات کا وعدہ لے کر آنے والے نے گیارہ سال تک آمریت کو ملک کا مقدر بنا دیا۔ اس دور میں مذہب کو ایک ڈھال کی طرح استعمال کیا گیا اور معاشرے میں لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا۔ ملک میں مجموعی سطح پہ ایک بے حسی اور مایوسی کی فضا پھیل گئی۔ آمریت کے علمبرداروں کی طرف سے طرح طرح کی پابندیاں لگیں اور بات کرنا جرم ٹھہرا۔ اس دور میں شعرا اور ادیبوں کے ہاں ردِ عمل کی ایک بڑی زورآور تحریک نے جنم لیا۔ مارشل لاء کے خلاف کہانیاں، افسانے اور نظمیں لکھی گئیں۔

گیارہ سال بعد مارشل لاء کا اختتام ہوا تو جمہورت کو کچھ راستہ ملا لیکن اس طویل مشقت کے سفر نے لوگوں کو بہت تھکا دیا تھا اور پژمردہ کر دیا تھا۔ لوگ سیاست کے کٹ کر، لاتعلق رہ گئے تھے۔ اس تعلق کی بحالی میں انفرادی اور مجموعی قومی سطح پر بہت سی توانائی خرچ ہوئی۔

۱۹۹۸ء میں کارگل جنگی تنازع کے بعد جب مسلح افواج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم پاکستان کے

درمیان تعلقات خراب ہوئے تو انھوں نے پرویز مشرف کو سربراہی سے ہٹانے کی کوشش کی۔ جوابی کاروائی میں فوج نے ۱۹۹۹ء میں بغاوت کر دی اور ۲۰۰۱ء میں جنرل پرویز مشرف نے صدر کے طور پہ حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ملک میں میں ایک بار پھر آمریت کا دور شروع ہو گیا۔ صدر مشرف کے دور میں ایٹمی مسائل، سانحہ لال مسجد، شمال مغربی پاکستان اور قبائلی علاقی جات میں جنگ، چیف جسٹس کی معطلی اور کئی دیگر تنازعات نے عوام میں شدید غم وغصہ پیدا کر دیا۔

پاکستانی شعرا کا سیاسی شعور:

ہمارے ملک کی تاریخی سیاسی لحاظ سے بہت سے مدوجزر لیے ہوئے ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ستر دہائیوں میں ملک نے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے۔ جمہوریت اور آمریت کی آنکھ مچولی چلتی رہی اور کہیں کہیں انقلاب کی لہروں نے سر اٹھانے کی کوشش بھی کی۔ ملک کے سیاست دانوں نے اسے ایک تجربہ گاہ سمجھتے ہوئے خوب تجربے کیے اور ان میں سے بیشتر نے اپنی نااہلیوں اور ناتجربہ کاریوں سے اسے نقصان پہنچایا۔ اس کے ردِ عمل میں کئی نظریات اور تحریکوں نے جنم لیا۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پہ بھی اس سیاسی اتار چڑھاؤ اور ملکی حالات نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ سیاست دانوں اور حکمرانوں کے ان تجربوں کی زد میں اس ملک کی عوام آئی تھی اور انھی میں فنکار بھی شامل تھے۔ مقتدر طبقے کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ عوام ان کے ہر صحیح غلط پر آمین کہتی رہے اور سوال اٹھانے کی ہمت نہ کرے۔ اس لیے ملک پاکستان میں بھی ہر آمر کے دور میں عوام پر بے شمار پابندیاں لگتی رہیں۔ ادیبوں، شاعروں کو اپنی مرضی سے لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ حکومت اور حکومتی مسائل پہ تنقید کی جرات کرنے والے اور حکمراں طبقے کی مرضی کے خلاف لکھنے والے سزا کے مستحق ٹھہرتے۔ اظہارِ خیال کی آزادی کا حق فنکار سے چھین لیا گیا تھا۔ فن کے ترجمان سچائی کا علم لیے زندگی کی شاہراہوں پہ چلنا چاہتے تھے لیکن آمروں کو یہ گوارا نہ تھا۔ کئی علم چھینے گئے، کئی بازو بھی کٹے۔ اپنے نظریات کے اظہار کے جرم میں بہت سوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی کاٹیں، پابندیاں بھی برداشت کیں۔ کئی نام ہیں جو فنکاروں کی اس فہرست کا حصہ ہیں جو سیاست میں عملاً شریک نہ ہونے کے باوجود اپنے الفاظ اور شاعری سے مزاحمت کی تحریک میں شریک رہے۔ سیاسی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنے دور کے سیاسی واقعات و رجحانات پہ بہت سی فکر انگیز نظمیں لکھیں اور پوری دیانت داری سے اپنے عصر کے سیاسی ماحول کی ترجمانی کی۔ ان میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، منیر نیازی، حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری، ایوب خاور، صفدر سلیم سیال اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔

پاکستانی شعرا میں فیض کا نام ایک ایسے شاعر کا ہے جو بیک وقت انقلاب اور رومان کے شاعر تھے۔ ان کے ہاں سیاسی رجحانات کو بڑے خوبصورت آہنگ اور اسلوب میں شاعری کا لبادہ پہنایا گیا ہے۔ سیاسی موضوعات اور سیاسی نقطہ نظر کو انھوں نے جذباتی نعروں یا خطابت کی شکل میں نہیں بلکہ بڑے جذبے اور عمدگی سے شعروں میں ڈھالا ہے۔ ان کی نظمیں آج بازار میں پابجولاں چلو، صبحِ آزادی، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، بول، نثار میں تیری گلیوں کے، ہم جو تاریک راہوں

میں مارے گئے، ترانہ اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، وہ نظمیں ہیں جو ان کے سیاسی شعور کی بہترین عکاس ہیں۔

فیض کے ہاں سیاسی جدوجہد صرف لکھنے تک محدود نہیں تھی بلکہ عملی میدان میں بھی انھوں نے بہت سی صعوبتیں برداشت کیں۔ اپنی اس جدوجہد کی حکایت وہ یوں بیان کرتے ہیں:

متاعِ لوح قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض کی نظموں میں نہ صرف اپنے وطن پاکستان کے لیے حقیقی آزادی کی طلب، حسرت بن کے جھلکتی ہے بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں ہونے والے ظلم و ستم پر بھی وہ نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ جہاں جہاں دنیا میں انسانیت شکوہ کناں نظر آتی ہے، ان کی توجہ کھینچ لیتی ہے۔ یہی ایک بڑے شاعر کے سیاسی شعور کی پہچان ہے۔

سیاسی شعور رکھنے والے پاکستانی شعرا میں دوسرا بڑا نام حبیب جالب کا ہے۔ حبیب جالب نے ادب کی دنیا میں سیاسی شعور اور مزاحمت کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ انھوں نے حکومتِ وقت کے ہر غلط اقدام پہ کھل کر تنقید کی اور ہر ناجائز فیصلے پہ ذمہ داران کو بھرپور انداز میں للکارا۔ ان کی مشہورِ زمانہ نظم "دستور" سے کون واقف نہیں جو اس دور میں ایوب خان کے پیش کردہ آئین کے ردِ عمل میں ایک مزاحمتی نظم ہے۔ ان کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبحِ بےنور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

بد قسمتی سے اس ملک کی مختصر سی تاریخ میں سیاسی اجارہ داری اور گنتی کے چند لوگوں کے مفاد نے اسے ترقی کی منازل تک پہنچنے اور آگے بڑھنے سے ہمیشہ روکے رکھا۔ بظاہر ہر طرف ہنگامہ اور شور و غل بپا رہا لیکن یہ ہنگامہ کسی فائدہ مند حرکت کا نہیں تھا بلکہ انارکی اور افراتفری نے عوام میں بے سمتی پیدا کر دی تھی۔ اس دلخراش حقیقت کو منیر نیازی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

جاوید انور کی نظموں میں سیاسی شعور:

ایک ادیب یا شاعر اپنے معاشرے اور اپنی تہذیبی وراثت سے عمدہ چیزوں کو سنبھالتا ہے اور کج رویوں کو ختم کرنے

کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس مثالی دنیا کے خواب دیکھتا ہے جو موجود تو نہیں لیکن اس کا خاکہ اس کے ذہن میں ہے۔ اپنے نظام کی کجیوں اور کمیوں کے خاتمے کی خواہش اور انھیں بدلنے کو کوشش ایک سچے ادیب کے مزاج میں شامل ہوتی ہے۔ ادب فقط ذہنی عیاشی کا سامان نہیں ہے اور نہ ہی بن سکتا ہے کہ بہر حال ہر ادیب اسی معاشرے کا فرد ہے جس میں وہ اپنے روز و شب لاتعلق رہ کر نہیں گزار سکتا۔ اس کائنات کی سچائیاں، انسانی معاشرے کے مشاغل و مسائل اور حقائق ادب کا حصہ ہیں اور ان سے کٹ کر وہ ادب وجود میں نہیں آسکتا جو آنے والے زمانوں میں زندہ رہ سکے۔

جاوید انور نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ صدر ایوب کے مارشل لاء کا دور تھا اور جب وہ جوان ہوئے تو اس ملک میں جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء لگ چکا تھا۔ عمر کے بتیسویں سال میں جب جاوید انور کی پہلی کتاب شہر میں شام منظرِ عام پہ آئی تو وہ تین مارشل لاء بھگتا چکے تھے۔ سیاسی دباؤ اور جبر کے اس سخت ماحول میں جہاں ایک عام آدمی کھل کے سانس نہیں لے سکتا وہاں ایک حساس تخلیق کار کن کیفیات سے گزرتا ہے یہ وہی جانتا ہے اور پھر یہ کیفیات اس کی شاعری میں در آتی ہیں۔ ملک و معاشرے کے حالات اسے اداس کرتے ہیں اور قلم کی منہ زوری اسے خاموش نہیں رہنے دیتی۔ وہ جانتا ہے کہ شہر میں شام آچکی ہے۔ اداس اور دل کو گھبراہٹ میں مبتلا کرنے والی شام۔ تخلیقی کرب اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کہیں کھل کے صدا لگائے اور کہیں علامتی انداز اختیار کرے۔

جاوید انور کے ہاں بھی یہ شام ایک پریشانی اور اداسی و مایوسی کی کیفیت ہے جس میں وہ شہر والوں کو مبتلا دیکھتے ہیں اور پھر اس کا نوحہ کہتے ہیں۔ جمہوریت کے نام پہ بننے والے اس وطنِ عزیز میں بار بار آمریت کا نفاذ کسی باشعور انسان کو قبول نہیں تھا۔ اور شاعر یا ادیب جس کا مسلک ہی آواز اٹھانا ہے وہ کیونکر چپ رہ سکتا ہے۔ انسانی تجربات اور اقدار متحرک ہوتے ہیں اور ارتقا پاتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کا ذہنی شعور ترقی کرتا گیا، ان کا مطالعہ وسیع ہوتا رہا، اور انکے خیالات میں بھی پختگی آتی رہی۔ ان کا شاعرانہ خلوص اور صداقت انھیں کسی مصلحت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

جبر کے معاشرے میں سچ بولنے کی قیمت فتووں، تہمتوں اور سزاؤں کی صورت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے سیاسی ماحول اور واقعات و سانحات پہ قلم اُٹھانا دل گردے کا کام ہے۔ سو کئی ادیب و شعرا اس سے پہلو تہی برت کر گزر جاتے ہیں لیکن ایک سچا ادیب کبھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جاوید انور بھی ایک حساس طبیعت، انسان دوست اور سچے شاعر تھے۔ انھوں نے اس فریضے کو احسن انداز میں نبھایا اور اپنی نظموں میں اپنے حالات کی بڑی واضح منظر کشی کی۔ شہر میں شام کی نظموں کے عنوانات کا جائزہ لیں تو کئی عنوانات خود اپنے آپ میں ایک کہانی ہیں۔ مثال کے طور پہ چند ایک کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ تم کہو تو کہوں

نظم کا عنوان اس گھٹن کو بیان کر رہا ہے جہاں بات کرنے کی بھی آزادی نہیں۔ گویا زباں بندی کے اس ماحول میں اگر اجازت ہو تو سچ کا آئینہ دکھاؤں۔ صاف بات کروں۔

۲۔ شہرِ سبا میں سناٹا ہے

شہرِ سبا، جاوید انور کے ہاں ایک جنت جیسا مثالی اور خیالی شہر ہے جس میں ویرانی اور ہو کا عالم ہے۔ یعنی اس ملک اس معاشرے میں جو خوشگوار ماحول کی توقع تھی، شہرِ سبا میں پہنچ کر اندازہ ہوا اس باغ میں خزاں کا عالم ہے۔

۳۔ نیا تماشا

یہ جاوید انور کی ایک طویل نظم ہے۔ اس نظم کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ عنوان کو دیکھیں تو گویا اس ماحول کو ایک تماشا گاہ کہا گیا ہے جہاں آئے روز تماشے ہوتے ہیں بس کردار بدل جاتے ہیں۔ تاہم عوام ہمیشہ خاموش تماشائی رہتے ہیں۔

۴۔ ایک شرمندہ نظم

ایک شاعر جب اپنا مدعا نہ کہہ پائے، یا جس خیالی معاشرے کی اسے چاہت ہو، اور جس آزادی کا وہ طلب گار ہو، حقیقت اس کے برعکس ہو تو وہ اپنے الفاظ کی بے توقیری اور بے وقعتی پر پشیماں ہوتا ہے، خود اپنے سخن سے شرمندہ ہوتا ہے۔

۵۔ اپاہج دنوں کی ندامت

نظم کا عنوان بڑا معنی خیز ہے جو بیک وقت اپنی بے بسی اور مجبوری کا تذکرہ کرتا ہے کہ اپاہج اور بے کار دن جو کسی افادیت میں اپنا حصہ نہیں ڈال سکے اب وہ اپنے کچھ کر نہ سکنے پہ ندامت اور شرمندگی میں مبتلا ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کئی نظمیں ہیں جو اپنے عنوان سے اپنا حال کہہ رہی ہیں۔ ان میں نوائے گمراہِ شب، ایک مصلوب آواز، جلاوطن، سورجوں کا سفر، کس حبس کا موسم ہے اور دیگر کئی نظمیں شامل ہیں۔

آمر حکمران ہمیشہ فن کاروں خصوصاً ادیبوں اور شاعروں سے خوف زدہ رہے ہیں کیونکہ ایک قلم کار بات کہنے کا ہنر بھی جانتا ہے اور جرات بھی رکھتا ہے۔ اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آمریت کے دنوں میں شاعر اور ادیب ہمیشہ ہدفِ تنقید بنتے ہیں اور ان پہ کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ ان کا ایک بھی چبھتا ہوا جملہ یا بات فوراً پکڑ میں آتا ہے۔ ہر وہ شاعر جو اپنے دور کے سیاسی حالات و واقعات کا خاموش تماشائی نہ ہو، بلکہ ایک متحرک اور باشعور فرد کی حیثیت سے آواز بلند کرے اور اپنی رائے میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہ لے، اس کی شاعری وہ مزاحمتی ہتھیار ہے جو اس کی آواز کو زندہ رکھتا ہے اور آمر اسی ہتھیار سے خوف زدہ ہے۔ لیکن آواز دبانے کی یہ کوشش بھی ایک شاعر کو اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جاوید انور بھی انھی شعرا میں سے ہیں۔ اپنی ایک نظم "بولتا کیوں نہیں" میں کہتے ہیں:

تو نے کیوں اپنے گالوں پہ سرسوں ملی
تو نے کیوں اپنی آنکھوں میں چونا بھرا
تیری گویائی کس دشت کے بھیڑیے لے گئے
بولتا کیوں نہیں؟

جاوید انور کی پریشانی محض اتنی نہیں تھی کہ ملک پہ قابض حکمران جابر اور سخت گیر ہیں بلکہ اس بات کا بھی دکھ تھا کہ عوام بھی محکوم بننے پہ رضامند ہوئے جاتے تھے۔ اس دیس کے باشندے جو اس زمین کے محافظ تھے، انھوں نے ہی ہتھیار

پھینک کر اپنی شکست قبول کر لی تھی۔ اپنی ایک نظم کے آغاز میں کہتے ہیں:

حرف کے تار میں جتنے آنسو پروئے گئے
درد اُن سے فزوں تھا
سنو تو کہوں
تم کہو تو کہوں ظرف کی داستاں
کھیتیوں کو گلہ بادلوں سے نہیں سورجوں سے بھی تھا
بازوؤں سے بھی تھا، ہل پکڑنے سے پہلے ہی جو تھک گئے
کشتِ زرخیز پر آبِ نمکین جم سا گیا
رقص تھم سا گیا

مندرجہ بالا نظم میں جاوید انور نے سورجوں سے جو گلہ کیا ہے وہ درحقیقت ان ذی شعور انسانوں سے ہے جنھوں نے سیاسی کشمکش کے دنوں میں باقی سادہ لوح وام کو راستہ دکھانا تھا، صحیح غلط کی تمیز سکھانا تھی اور انھیں وہ ہمت اور طاقت دینی تھی جو اس ملک اور نظام کی کھیتی میں ہل چلا کر اسے پھر سے زرخیز کر سکیں کیونکہ اس ملک کا اصل اثاثہ اس کی عوام ہی ہیں جنھیں اقبال نے بھی اپنی شاعری میں کشتِ زرخیز کہا تھا۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

یہ ذی شعور انسان جنھیں جاوید انور نے استعاراتی انداز میں سورج کہا ہے، ان میں ہر وہ فرد شامل ہے جو اس ملک میں کسی نہ کسی شکل میں کوئی پاور، کوئی طاقت یا صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے مؤثر استعمال کے لیے اس کے پاس پلیٹ فارم بھی ہے۔ ان میں علما اور دانش ور بھی ہیں اور شاعر اور ادیب بھی۔ صحافی بھی ہیں اور میڈیا کے نمائندے بھی۔ وہ تمام لوگ جو کسی سیاسی نظام کے نفاذ میں عملی طور پر شریک ہوتے ہیں ان سب پر یہ ذمہ داری لاگو ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو حقائق سے آگاہ کریں، ان میں شعور پیدا کریں اور ان کی فلاح و بہتری کے لیے ہر ممکن اقدامات کریں۔ اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، حق اور باطل کا فرق واضح کریں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے خول میں بند ہو کر حقیقت سے منہ موڑے بیٹھے تھے۔ انھوں نے کوشش ہی ترک کر دی تھی۔ چند ایک جنھوں نے کوشش کی اور ذمہ داری کا بار اٹھایا، وہ بھی جلد ہی تھک کر بیٹھ گئے۔ اس مضمون کو جاوید انور نے اپنی ایک اور نظم میں بھی ایک اور علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

کسی سیلِ نور میں بہہ گئے
وہ جہازراں بھی، جہاز بھی
شبِ تار کا جو حصار توڑ کے آئے تھے
کھلے پانیوں کے نواح میں

گویا وقت کے دھارے کے رخ پہ وہ لوگ بھی تنکوں کی طرح بہہ گئے جو کسی وقت میں رات کی چار دیواری پھلانگ کر، تاریکی کا پردہ پھاڑ کر باہر نکلے تھے۔ گردشِ حالات نے انقلاب کے علمبرداروں کو بھی خالی ہاتھ کر دیا۔ ایک شاعر جس

مثالی دنیا کے خواب دیکھتا ہے، وہ اپنے معاشرے کو انھی پیمانوں پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر حقیقت اس کے برعکس ہو تو اس کے شکستہ خوابوں کا نوحہ اس کی شاعری میں در آتا ہے۔ جاوید انور کی نظم ''شہرِ سبا میں سناٹا ہے'' اس مثالی اور خیالی شہر کی نظم ہے جس کے تصور میں شاعر نے اپنے بچپن کے خواب بنے لیکن بڑے ہوئے اور حقیقت کی دنیا میں آئے تو معلوم ہوا کہ شہرِ سبا ایک سراب ہے، شہر وہ نہیں، یہ ملک، یہ جنت وہ نہیں جس کی تلاش میں نکلے تھے۔ بلکہ اس شہر میں ویرانی اور بربادی ہے، جن دروازوں اور نقش و نگار سے سجی دیواروں کا تصور کیا تھا، جن رنگوں، خوشبوؤں اور ستاروں کی تلاش تھی، ان میں سے کچھ بھی وہاں موجود نہیں بلکہ صرف خالی خلائیں گھوم رہی ہیں۔ گویا جو سبز باغ معصوم آنکھوں کو دکھائے گئے اور جن وعدوں کی تکمیل کی آس میں لوگ سفر کرتے رہے، وہ سب الٹ نکلے اور توقعات کا مینار دھڑام سے آ گرا۔ بچپن اور لڑکپن کے امید افزا خواب، کچھ نیا کرنے کی آرزو اور دنیا کو بدل کر رکھ دینے کا عزم جب وقت گزرنے پر حقیقی دنیا کی رکاوٹوں اور سرابوں سے ٹکراتا ہے تو ریزہ ریزہ ہونے لگتا ہے۔ یہ نظم اس شکست اور افسردگی کی تصویر ہے۔

نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو!

شہرِ سبا میں سناٹا ہے
محرابی دروازوں اور منقش دیواروں کی کاہکشاں میں
صرف خلائیں گھوم رہی ہیں
اپنی آنکھیں اپنے ستارے ڈھونڈ رہی ہیں
پوچھ رہی ہیں
خالی ہاتھ پہ رنگِ بصارت کب ٹھہرے گا؟
سنگِ سماعت کب پگھلے گا
شہرِ سبا! ہم تیرے سخی تھے، تیرے گدا ہیں
سارے درہم سب دینار ترے دیدار پہ وار آئے ہیں
تیری گلی میں تختِ سلیماں ہار آئے ہیں

ایک باشعور شاعر کی ابتدائی نظموں میں جو ایسے ہوتے ہیں وہ بظاہر شخصی نوعیت کے بھی ہوں لیکن لاشعوری طور پر انفرادی دائرے کو توڑ کر اجتماعیت کے دائرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ تاہم جیسے جیسے شاعر کا شعوری سفر آگے کی منزلیں طے کرتا ہے، اس کا غم، اپنے زمانے کا غم بن جاتا ہے۔ جاوید انور بھی اپنے عصر کے مصائب و مشکلات کے ترجمان بن گئے۔ جب انھیں اپنے دور کے سیاسی و سماجی مسائل سے نمٹنا پڑا تو ان کا سخن، ان کا قلم ان کی ذات تک محدود نہیں رہا، بلکہ اپنے ہم جنسوں کی پریشانی دیکھ کر ان کی آواز بن گیا۔

اسی لیے جب وہ اپنی چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی کرتے ہیں تو ان کی یہ نظم ان کی ذات کا نوحہ نہیں رہتی بلکہ ان کے عہد کا نوحہ بن جاتی ہے۔

نظم کے آغاز میں لکھتے ہیں:

عمر کی گٹھڑی کُھلی تو اسلحہ تھامے ہوئے دن تھے مقابل میں
نہ شب کی موت دیکھی
اور نہ دن کی حدتیں ہی جلد پر محسوس کر پائے
سوائے چمنیوں کی سانس کے!
ہم ہاتھ میں چھریاں لیے سہمی ہوا کو کاٹتے ہیں
برتھ ڈے کا کیک کٹتا ہے

جاوید انور کا تعلق شعرا کی اس نسل سے ہے جنھوں نے پہلے مارشل لاء کے دور میں آنکھ کھولی اور دوسرے اور تیسرے مارشل لاء میں جوان ہوئی۔ انھوں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ ایک شدید سیاسی ہیجان کے ماحول میں گزارا۔ سرکاری اداروں اور قانون کی بے حرمتی اور عوامی حقوق کی پائمالی نے لوگوں میں وحشت اور گھٹن پیدا کر دی تھی۔ ملک میں خوف و دہشت کی فضا تھی اور عام عوام ہراساں زندگی گزار رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کم عمری میں ہی سیاسی و سماجی طور پہ اتنے باشعور ہو گئے کہ ان میں یہ احساسِ ذمہ داری بھی پیدا ہو گیا کہ ایک شاعر اور قلم کار ہونے کے ناطے اس پہ بات کرنا ان کا فرض ہے۔ سیاست لاشعوری طور پر بھی ان کے تخلیقی عمل کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔
نظم میں آگے چل کر کہتے ہیں:

یہاں جب دن نکلتا ہے
تو مائیں اپنے بیٹوں کی جرابوں پر گھروں کا راستہ لکھ کر
گلی میں پھینک دیتی ہیں
یہاں جب شام ہوتی ہے تو بستے روٹھ جاتے ہیں
یہاں منزل سے رستے روٹھ جاتے ہیں
یہ شہروں کی کہانی ہے

شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ ملک یہ معاشرہ آزاد نہیں۔ ہر چیز کے گرد ایک چار دیواری ہے جسے پھلانگنا جرم ہے اور جن حدود میں رہنے کا حکم آمریت کی طرف سے نافذ کیا گیا ہے ان سے باہر نکلنے کی سزا سخت ہے۔

ساری بستی رات کے معبد میں ہے
باہر اندھیری شب کی حد میں رہ کے سورج بھی نکلتا ہے
مگر سورج مکھی کا رخ زمیں کی سمت رہتا ہے
یہاں سب اپنے گھر کا قفل باہر سے چڑھا کر گھر کے اندر جاگتے ہیں
پھر بھی ڈرتے ہیں
ہر اک دستک یہاں پر دستکِ مرگِ مسرت ہے

زباں سے حرف، ہاتھوں سے کمانیں چھین کر بھی خوش نہیں گلیاں
جو اں ماؤں سے پہلوٹھی کے بیٹے قرض لیتی ہیں
مگر واپس نہیں دیتیں
ہوا کے ہاتھ میں ہیں پر پرندوں کے
تو آنکھیں گھونسلوں میں ہیں

نظم کی یہ سطور اس خوف کے ماحول کی منظر کشی کر رہی ہیں جہاں اپنی مرضی سے سانس بھی لینے پر پابندی ہے اور ایک مستقل خدشہ ماحول میں اور لوگوں کے دلوں میں موجود ہے کہ جانے کون سا عمل ان کا جرم ٹھہرے۔ کب ان سے احتجاج کا حق چھین کر ان کی مہنگی جانوں کے سستے سودے کر لیے جائیں۔ جاوید انور نے اپنے دور کے ہر انسان کے دکھ، خوف، خدشات اور مایوسی کی نمائندگی کی ہے۔ نظم ''کربلا سے امام باڑے تک'' شہر میں طاری خوف کی فضا اور خاموشی کے کڑے پہرے کی ایک اور تصویر ہے۔ اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں مرنے والے لوگوں کا المیہ ناقابلِ بیان ہوتا ہے۔ شاعر نے نظم میں شہر کا ایک خوفناک منظر بیان کیا ہے جس میں خاردار تاروں پر کسی کے پھٹے کرتے کی دھجیاں ہیں اور کسی باپ کی گود میں ایک ننھا بچہ بندوق کا نشانہ بنا ہے۔ اس میں زیادہ بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ بندوق کسی لٹیرے، رہزن کی نہیں تھی بلکہ رہرو اور محافظ کی تھی۔ نشانہ بنانے والا کوئی ڈاکو نہیں بلکہ سپاہی ہے۔ یہ منظر اس ماحول کا ہے جہاں عوامی اداروں کو عوام کے تحفظ کے بجائے ان کے مقابل کھڑا کر دیا جائے۔ حکومتِ وقت جب اپنی مرضی کے قوانین بناتی ہے تو ان کے نفاذ کے لیے سرکاری اداروں کو استعمال کرتی ہے۔ دفاعی ادارے اور پولیس سے اس زبردستی کے نفاذ کا کام لیا جاتا ہے اور انھیں عوام کے بالمقابل کھڑا کر کے دونوں میں تصادم پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں دونوں طرف عام لوگ ہوتے ہیں اور اقتدار کے مزے لوٹنے والے اپنے نرم بستروں میں بیٹھے یہ تماشا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شہر کے اس حبس زدہ موسم کی جھلک جاوید انور کی کچھ اور نظموں میں بھی ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم کی چند سطریں درج ذیل ہیں:

کس حبس کا موسم ہے
اس بامِ تمنا پر
زلفیں ہی نہیں کھلتیں
کس جبر کا موسم ہے
آنکھیں ہی نہیں کھلتیں
زنجیر تو ہلتی ہے
آواز نہیں آتی
ہاں آبِ رعونت میں
اک عکس اترتا ہے

پر چاند نہیں بنتا
کس جبر کا موسم ہے
کس حشر کا موسم ہے
اس شہر کے زندانی
اک آس پہ زندہ ہیں
سانسیں بھی نہیں لیتے
پتھر بھی نہیں بنتے

اس نظم کے حوالے سے جاوید انور کے دوست اور شاعر سلمان صدیقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ”جاوید انور شاید اس بات پہ مشکوک ہے کہ دنیا اپنی سمت کا درست تعین کر بھی سکے گی یا نہیں؟ شاید اسی لیے اس کے ہاں ایک بھرپور استفہامیہ انداز بار بار نمودار ہوتا ہے جو بہر حال سخت مایوس ہونے کے باوجود روشن خیالی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا حالانکہ یہ میں جانتا ہوں کہ اب جاوید انور صرف پاکستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے مستقبل کے لیے مخدوش رائے رکھتا ہے لیکن بطور ایک دانش ور کے وہ ابھی تک اصولِ بے یقینی میں خود کو کہیں رکھ کر کچھ اچھا ہی لکھنے کی کوشش میں ہے۔ اسی لیے ایک بھرپور اور مضبوط استفہامیہ انداز جاوید کی شاعری میں جابجا موجود ہے جو زندگی کو تقویت دینے کا سبب ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی اس کی یہ نمائندہ نظم مثال کے لیے پیش کی جاسکتی ہے “(۵)

جاوید انور کی شاعری سیاسی شعور کے نتیجے میں پنپنے والی مزاحمت کا ایک سفر ہے۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد بہت سے شعرا اور ادیبوں کو کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۸۵ء میں اہلِ قلم کے نام سے جو کانفرنس ہوئی، اس میں ضیاء الحق نے ادیبوں اور شعرا کو دھمکانے کی کوشش بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے سیاسی حق کے لیے آواز اٹھانے والے لوگ اور حکومت کے ناقد دراصل ملک دشمن ہیں۔ گویا کسی بھی قسم کی انقلابی نوعیت کی شاعری کرنے والے لوگ وطن دشمن ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں حکومت کے خلاف کوئی بھی بات کرنے یا تنقید کرنے والوں کو ہراساں بھی کیا گیا خصوصاً ترقی پسند ادیب اور شاعر اس پابندی کی زد میں زیادہ آئے۔ جاوید انور اگرچہ باقاعدہ طور پر کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے تاہم نظریاتی اعتبار سے وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے خود کو عملاً سیاست سے دور رکھا تاہم ایک باشعور اور روشن خیال انسان ہونے کے ناطے اور ترقی پسند رجحان کی بدولت اپنے نظریات اور مزاحمت کو شاعری کا حصہ ضرور بنایا۔ جاوید انور اس دور کے ایک اہم ترقی پسند شاعر اختر حسین جعفری سے بہت متاثر تھے۔ جعفری صاحب کی فکر اور اندازِ سخن کے مداح ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں کچھ نظموں میں اس کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ وہ مشہور افسانہ نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی کے بھی بہت معتقد تھے۔ انھوں نے ان دونوں حضرات کی وفات کے بعد ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نظمیں بھی لکھیں۔

جاوید انور کی کئی نظمیں ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف کھلا احتجاج ہیں۔ ضیاء دور کا ایک بڑا المیہ یہ تھا کہ لوگوں

کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مذہب کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اسلامی قوانین کے نام پر لوگوں کو سرِ عام کوڑے مارے گئے اور کئی جگہوں پر شدید جبر و تشدد کے ماحول نے جنم لیا۔ جاوید انور نے یہ سارے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لیے اس ظلم کے خلاف ان کی آواز خاموش نہیں رہ سکی۔ ان کی ایک طویل نظم نیا تماشا اس دور کے جبر و استبداد کی تصویر ہے۔ اس نظم میں ماحول کی منظر کشی بھی ہے، ہر اسانی و بے بسی کی التجا بھی، احتجاج کا نعرہ بھی اور ظلم کی شام ختم ہونے کی ایک امید بھی۔ نظم کے کچھ حصوں کا جائزہ درج ذیل ہے:

غرورِ قربِ خدا میں ڈوبے ہوئے فرشتے پکارتے ہیں
کہ پیٹھ ڈھانپو
یہ پیٹھ
تازہ ہیں داغ جس پر ابھی پُرانی جراحتوں کے
یہ داغ ڈھانپو
کہ ان سے رِستا لہو بہت اشتعال انگیز ہو رہا ہے
ہمارے پٹھے اکڑ رہے ہیں
ہمارے ہاتھوں میں تازیانے
ہماری آنکھوں سے منقسم ضابطوں کے شعلے برس رہے ہیں
سارے خوں کا فشار وہ سجدۂ ناگزیر ہے جو ہمیں گذشتہ بنا گیا ہے
مگر نہ بھولو کہ آج کے سر پہ بھی ہماری ہی چھتریاں ہیں
یقین جانو
برہنگی کی سزا تمہاری ہی منتظر ہے

نظم کا یہ پہلا بند ان مذہبی علمبر داروں کے ظلم اور سختی کا بیان ہے جنھوں نے جنت دوزخ کا ٹکٹ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا اور جو اس زمین پر نائبِ خدا نہیں بلکہ خود خدا بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلام کو جبر اَعائد کرنے کی کوشش میں لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کر دیا تھا۔ یہ وہ دین تھا جسے خود اس کے لانے والے پیمبر نے بھی تلوار اور جبر کے بل پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار کے ہتھیار سے لوگوں کو رام کیا تھا اور ان کے دل موم کر دیے تھے۔ لیکن اس نبی کے امتیوں نے مذہبی ٹھیکیدار بنتے ہوئے لوگوں کو جوڑنے کے بجائے توڑ پھوڑ دیا۔ ماحول کی اس تاریکی اور ظلمت کو آگے چل کر جاوید انور نے واضح کرتے ہوئے اس بے حسی کی داستان سنائی ہے جہاں حاکم کا بس نہیں تھا کہ عوام جس ہوا میں سانس لے رہی ہے، وہ ہوا بھی اپنے قبضے میں کر لیں۔

قسم ہے دن کی
کہ شب کی چادر بھی پھٹ چکی ہے
قسم ہے فولادی گولیوں کی

کہ زخم بازامیں تماشابناہوا ہے
گلی گلی میں یہی صدا ہے
یہی سزا ہے جو گھر سے باہر قدم رکھو تو
قدم رکھو تو پتہ چلے یہ
سڑک نہیں تار کول کی دلدلیں ہیں، ڈوبو
تو پھر نہ اُبھرو!
مگر ابھی تو تمہارے جوتے گھسے نہیں ہیں
تمہاراکالر پھٹا نہیں ہے
ابھی تمہاری چھتوں کے نیچے ہوا بہت ہے
تم اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہو!

حقیقت تو یہ ہے کہ مخلوق خدا کی بے بسی پر خدا کبھی خوش نہیں ہوتا خواہ وہ جبر اور بے بسی خود خدا کو خوش کرنے کے لیے لوگوں پر مسلط کر دی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام جبر کا دین نہیں ہے۔ مذہب اور خدا کو محض دکھاوے کے لیے جس طرح سجایااور استعمال کیا جاتا رہاہے، اس کی شرمناک مثالیں جابجاملتی ہیں۔

مسیح تصویر ہے۔۔۔۔ سدا سے
فریم کی قید کاٹتا ہے
ہجوم سڑکوں پہ ناچتا ہے!
ہجوم تاریخ کا تماشہ
ہجوم بینر، ہجوم نعرہ
ہجوم پتلے جلا رہا ہے

ہجوم کی یہ منظر کشی اس دور کے عام آدمی کے نفسیاتی دباؤ اور ذہنی کشاکش کو ظاہر کرتی ہے۔ جس معاشرے میں انسانوں کو ان کے حقوق قانون اور آئین کے مطابق درست طریقے سے نہ ملیں وہاں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بغاوت کا شدید ریلا آتا ہے اور پھر انتقام اور نفرت کے اس سیلاب میں سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ کوئی قانون کوئی ضابطہ باقی نہیں رہتا۔ ہجوم جنونی ہو جاتا ہے۔ تخت الٹ دیے جاتے ہیں اور لوگ اقتدار کی کرسی پہ بیٹھے شخص کے گریبان تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ جاوید انور نے ہجوم کی اس نفسیات کا ذکر کرنے کے بعد ان درباریوں کی بھی تصویر کھینچی ہے جو آمریت کے تخت میں ساجھے دار تھے، جو اعلیٰ عہدوں پر بیٹھ کر اقتدار کی باگ ہاتھ میں تھامے اندھادھند سرپٹ دوڑے چلے جارہے تھے۔ جاوید انور نے ان عہدہ داروں، درباریوں اور شاہ کے مصاحبوں کو "مسخرے" کہہ کر پکارا ہے۔ ان کی اپنی کوئی سوچ ہے نہ فکر، یہ بس حکم کے غلام اپنے سے نچلے غلاموں پر کوڑے برسانے والے اور شاہ کی خوشامد کرنے والے لوگ ہیں۔

یہ مسخرے ہیں

نجات کی عرضیاں ابھی تک اُسی ستارے کو بھیجتے ہیں
جو دُھند کے مورچے میں ہے اور
شب کو تقدیر لکھ رہا ہے!
مسیح مصلوب ہو چکا ہے
خدا پسِ خلد رو رہا ہے
کہ ہنس رہا ہے۔۔کسے خبر ہے

نظم کے آخر میں انھی مسخروں کو شاعر نے ملائکہ کہا ہے۔ دراصل یہ ایک طنزیہ لہجہ ہے کہ مذہب کے یہ ٹھیکیدار گویا فرشتے بن کر انسانوں کے حساب کتاب اور جزا و سزا میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر شاعر ان کے اس عہدے کو ماننے سے انکاری بھی ہے اور صدائے احتجاج بھی بلند کرتا ہے کہ وہ ان زمینی خداؤں کو خدا ماننے پہ تیار نہیں۔

ملوا نہیں یہ ملائکہ ہیں
سفید وردی
سنہری تمغے
سیاہ محراب دار ماتھا
جمالِ گُربہ
جلالِ شاہیں
ملائکہ ہیں!
"ملائکہ ہیں تو ہم انہیں ماننے سے انکار کر رہے ہیں
یہ چھتریاں ہیں تو ہم انہیں تاننے سے انکار کر رہے ہیں
ہمارا انکار درج کر لو"
ہمارا اقرار درج کر لو۔۔۔ہم آ رہے ہیں
(صدائے معتوب چیختی ہے)
صدائے معتوب، مرقدِ بے نشاں کی مٹی،
نئے کھلونے
نیا تماشہ کہ سر بُریدہ حروف اسناد بن گئے ہیں
وہ جسم فولاد بن گئے ہیں
جو تم نے آتش کدوں میں پھینکے تھے جشن کی شب
کہ شعلۂ فتح بجھ نہ پائے
کسی سڑک پر جما ہوا بے صدا لہو تھا
کہ آج پرچم بنا ہوا ہے

شکستہ دیوار گر رہی ہے
غلام چہرے بدل رہے ہیں
صلیب ڈھانپو
تمہارے مصلوب آ رہے ہیں
تمہارے مصلوب آ رہے ہیں

ہر بڑے شاعر کے ہاں اس کے عہد کی تاریخی حقیقتیں نظر آتی ہیں اور ان کے بیان میں ایک شاعر کے گہرے سیاسی و تاریخی شعور کا بھی پتا چلتا ہے۔ اردو شاعری کی سیاسی و فکری روایت کا پس منظر رشید امجد اپنی کتاب میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی ابتدا کے بعد جو جبر و تشدد اور سیاسی خوف کی فضا ہماری شاعری کے پسِ منظر میں مسلسل موجود رہی ہے، اس کا تسلسل بیسویں صدی میں بھی جاری رہا، بس اس کی صورتیں بدلتی رہیں، اس لیے ردِ عمل، احتجاج اور مزاحمت ہماری شاعری کی ایک روال روایت ہے جو آزادی کے بعد بھی جاری رہی۔ وجہ یہ کہ آزادی کے بعد بھی خوابوں اور آدرشوں کو تعبیر نہ ملی۔ سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کا دور نہ صرف جاری رہا بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد اس میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ قیامِ پاکستان سے ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء کی عوامی تحریک، پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء اور پھر ۱۹۸۸ء میں اسمبلیوں کی برطرفی تک آمریت اور جبر واستبداد کا وہی ڈرامہ مختلف شکلوں اور کرداروں کے توسط سے کھیلا جاتا رہا۔ انگریز چلے گئے لیکن ان کے گماشتے سامراج کی حفاظت کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ سماجی، تہذیبی اور اخلاقی انحطاط سے ہمکنار ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جمہوریت اور مارشل لاء کے عرصے کا تعین اور جمہوری اداروں کا زوال الگ مطالعے کا متقاضی ہے۔ تشدد کی فضا، عدم معاشی مساوات اور سیاسی جبریت ہمارے ادیب کو ورثے میں ملے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والی نسل کے یہاں بے اطمینانی اور خوابوں کی شکست و ریخت کا منظر نامہ اسی زوال سے وابستہ ہے۔ اس کا اظہار کہیں علامتوں، کہیں استعاروں، کہیں کلاسیکی تلازموں اور کہیں سیدھے سادے بیانیہ میں ہوا ہے۔"(۶)

آزادی کا خواب دیکھنے والی نسل نے جب اپنی تعبیر کو اس شکستہ حالت میں دیکھا تو انھیں اپنے خواب دیکھنے تک پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اس کٹے پھٹے مبہم خاکے کو دیکھ کر اور اجتماعی سیاسی دھوکے سے پیدا ہونے والی افسردگی اور ملال اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں جابجا نظر آتا ہے۔ جاوید انور بھی اس جستجو میں سرگرداں ہیں کہ آزادی کی دیوی کا پتہ معلوم کر سکیں اور اس شہرِ سبا کا سراغ پالیں جو جنت نظیر تھا۔ اس مضمون کو جاوید انور نے "ایک شرمندہ نظم" میں یوں

بیان کیا ہے۔

اے حرفِ سحر آثار، اے رنگِ آزادی!
میں نے تو نہیں دیکھا،
ترے لمس سے کون ساسنگ گلاب ہوا،
آئینہ آب ہوا
کس باغ میں کون سی مشتِ خاک کُھلی
خوشبو آزاد ہوئی!
میں بیس اور سات بہاریں اور خزائیں
ایک ہی موسم کی اجرک میں دیکھ چکا ہوں
لیکن میں نے وہ دن کس دن دیکھا ہے
جب آنکھیں روزن چھوڑ کے پھولوں کی کیاری میں بس جاتی ہیں
کوئل گاتی ہے

ملک کے مستقل خراب حالات کو ایک ہی چادر کی اجرک سے تشبیہ دے کر جاوید انور نے حسرت کا اظہار کیا ہے اور تمنا کی ہے کہ کب وہ دن دیکھنے کو ملیں گے جب ارض، پاکستان سیاسی جاگیر داروں کے قبضے سے آزاد ہو گا اور عام عوام کی آنکھیں روزن چھوڑ کر پھولوں کی کیاریاں دیکھیں گی۔ جاوید انور کی شاعری اس سیاسی تناؤ کے خلاف کی جانے والی فکری مزاحمت ہے۔ ان حالات میں وہ کہتے ہیں کہ شہر پہ ایک مستقل شام مسلط ہے۔ شہر بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہے اور آدمی کی روح یہ زخم جھیل جھیل کر شکستہ ہو چکی ہے۔ ملک کی باگ دوڑ جب کسی راہبر کے ہاتھ میں نہیں تو راہرو بس بے فائدہ چلے جا رہے ہیں۔ انھیں اپنی منزل کا کوئی پتہ نہیں۔ بے سمتی کا یہ عالم ہے کہ:

راستوں کا اخیر کوئی نہیں
مُڑ کے دیکھیں تو گھر بھی غائب ہیں

قیامِ پاکستان کے بعد بظاہر استعماریت کا خاتمہ ہوا تھا لیکن شروع میں برطانوی اثرات اور پھر امریکی استحصال اور دخل اندازیوں نے پاکستان میں سیاسی توازن قائم نہیں ہونے دیا۔ پاکستان کا قیام تو ایک جمہوری ریاست کے طور پر عمل میں آیا تھا لیکن پاکستانی عوام کے سیاسی حقوق ان ستر پچھتر برسوں میں ہمیشہ پامال ہوتے رہے۔ جمہوری رویوں کا فقدان رہا اور حکمرانوں کی طرف سے عوام کی سیاسی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں عائد رہیں اور ادبی تخلیقات میں بھی اپنے نظریات کے اظہار کو جرم بنا دیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کو درپیش مسائل اور سیاسی حالات نے ہماری قوم اور خصوصاً ادبا و شعرا پہ جو اثرات مرتب کیے، ان کا ذکر ترقی پسند شاعر اختر حسین جعفری نے اپنے ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا ہے:

”ایک تو ہماری سوشل اور پولیٹیکل ہسٹری میں ۱۹۷۱ء کا المیہ جب ہمارا ایک حصہ جغرافیائی طور پر کٹ گیا، پھر ۱۹۷۷ء میں ہمیں سیاسی جبر کا شکار ہونا پڑا۔ یہ خارجی سطح پر

دو بڑے تجربے تھے۔"(۷)

یہ وہ بڑے سیاسی المیے تھے جنھوں نے اس دور کے ہر ادیب اور شاعر کو متاثر کیا اور اس کا اظہار ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ جاوید انور کے ہاں بھی اس سیاسی اور استحصالی نظام کی کج رویوں اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی معاشرتی ناہمواریوں کا بڑا تفصیلی اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگر کسی ملک میں اس کی عوام سے آزادی اظہار کا حق چھین لیا جائے، بنیادی انسانی حقوق پائمال کر دیے جائیں تو اس عہد کے تخلیق کار اس دل خون کر دینے والے منظر اور ماحول میں کچھوے کی طرح خول میں بند بیٹھ کر شاعری نہیں لکھ سکتے۔ ان کی شاعری محض زبان کے ذائقے اور لطف اندوزی تک محدود نہیں رہ سکتی بلکہ اس میں ایک گہری معنویت جنم لیتی ہے۔ اس دور کے شاعر اور ادیب یا تو حبیب جالب کی طرح کھل کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں یا اپنا ایک الگ علامتی جہان تخلیق کر لیتے ہیں، لیکن بے حس اور خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھتے۔ ان کے اندر کا اضطراب اور بے چینی ان کی تخلیقات میں بہت واضح نظر آتی ہے۔ جاوید انور کی نظموں میں بھی یہ اضطراب، کرب اور احتجاج بہت صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ کہیں یہ دوٹوک الفاظ میں ہے اور کہیں بین السطور۔ ضیاء دور میں اس وقت کے جمہوری رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا واقعہ جمہوریت کے دامن پر ایک سیاہ دھبے کی صورت ہے۔ اس سانحے کو ایک نظم میں جاوید انور نے یوں رقم کیا ہے:

اپاہج فیصلے، جھوٹی گواہی، بے گنہ مجرم
سلاخیں شاہراہوں پر
کٹہرے میں عدالت بین کرتی ہے
مرے ٹی وی کی ہیروئن ترے دُرّوں سے ڈرتی ہے
مرا ہیرو تری سولی پہ ہنستا ہے
میں رونا بھول جاتا ہوں
وہ مجرم ہے اور اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے
وہ مجرم ہے، بدلتی آنکھ کے تیور نہ پڑھ پایا
ستارے بے جہت، بے انت شب، سولی اکیلی ہے
مرا ہیرو پسِ دیوارِ شب آنسو بہاتا ہے
سگِ آزاد کل سے آج تک اخبار پر پیشاب کرتا ہے
مجھے رونا نہیں آتا

اسی سانحے پر جاوید انور کے چند اور اشعار درج ذیل ہیں:

وہ تو سورج تھا کہ جو قتل ہوا آخرِ شب
بے گناہی کی ملی اُس کو سزا آخرِ شب
اپنے دامن میں چھپائے ہوئے اُس کی خوشبو

چیختی پھرتی ہے گلیوں میں ہوا آخرِ شب

مغربی استعماریت کے خلاف مزاحمتی نظمیں:

زندگی کی الجھنوں میں گرفتار آدمی، کسی خیالی دنیا میں فرار نہیں ڈھونڈ سکتا۔ زندگی کے حقائق کی پیچیدگیوں سے آگہی حاصل ہونے کے بعد انسان فطرت اور اپنے ماحول اور معاشرے سے زیادہ جڑ جاتا ہے۔ شاعر ہو تو اپنے عہد کی خارجی دنیا سے جڑ جاتا ہے اور اس کے مضامین آفاقی اور عالمگیر ہو جاتے ہیں۔ اس عہد میں جو رجحانات پروان چڑھ رہے ہوتے ہیں وہ اس کے اثرات قبول کرتا ہے اور اپنے تجربے کو زبان دینے کے لیے شاعری کا سہارا لیتا ہے۔

جاوید انور نے بھی اپنے دور کی سیاسی کشمکش کا گہرا اثر لیا اور اس دور کے سیاسی ہیجان اور انتشار کو اپنے شعری سفر میں نظموں کا حصہ بنایا۔ سیاست اور سیاسی شعور کی یہ جھلک جاوید انور کی نظموں میں جابجا ملتی ہے۔ ادب اور سیاست کے اس شعوری اور لاشعوری تعلق کے حوالے سے اختر انصاری لکھتے ہیں:

> ”ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیمیں صاحبِ اقتدار بالائی طبقہ کی ملکیت تھیں اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے، ادب اور سیاست کا تعلق بھی سرسری، سطحی اور معمولی تھا۔ پھر جب عوام میں سماجی احساس بڑھا اور سیاسی شعور پیدا ہوا اور خود سیاسی مسائل زیادہ اہم اور وزنی ہو گئے تو ادب اور سیاست کا تعلق بھی گہرا اور جاندار ہو گیا۔ آج کا ادیب اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سیاست اور اس کے ادب کا یہ باہمی تعلق محض اتفاقی نہ ہو بلکہ اس کی شعوری اور دانستہ کوشش کا نتیجہ ہو۔“(۸)

قومی اور عالمی مسائل پر ادیب اور شاعر کی گہری نظر ہونا ضروری ہے تبھی وہ اپنے مدعا کو بھرپور قوت سے جاندار الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ صرف سطحی معلومات اور جذباتی لگاؤ اس کی تخلیق کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسے کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے بلکہ پورے شعور اور غیر جانبداری سے سیاسی صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی فکر پیش کرنی چاہیے۔ جاوید انور کی نظمیں محض ہمارے ملکی حالات تک محدود نہیں بلکہ عالمی سطح پہ بھی ہر اس قوم اور معاشرے کی عکاس ہیں جہاں مجبور و محکوم انسان چند بڑی طاقتوں کے غلام ہیں۔ ان سے ان کے بنیادی انسانی حقوق تک چھین لیے گئے ہیں حتیٰ کہ احتجاج کا حق بھی انھیں نہیں دیا جاتا۔ ریاستی جبر اور عالمی طاقتوں نے پوری دنیا کو اپنے سامنے تپلی تماشا کرنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ سماجی اور سیاسی سانحات پہ احتجاج کرنے والی ہر آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور مزاحمت کرنے والا ہر فرد کچل دیا جاتا ہے۔ عالمی منظر نامے پہ کھیلا جانے والا آگ اور خون کا کھیل ان کے لیے گویا ہولی کا تہوار ہے۔

جاوید انور اس جبر و تشدد دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں۔ جہاں جہاں انسان طوق و زنجیر میں لپٹا نظر آتا ہے، جہاں انسانی خون پانی سے سستا ہو گیا ہے، جہاں جہاں انسان کو بولنے، لکھنے اور آواز اٹھانے، سوال کرنے کی آزادی نہیں، ان کے لیے ایک حساس شاعر ہونے کی حیثیت سے انسانی حقوق اور جذبات کی یہ پامالی ناقابلِ برداشت ہے۔ انسان کی تذلیل اور انسانیت

کا کرب انھیں بے چین رکھتا ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ کوئی امن و سکون کی فضا قائم کر سکیں۔ان کی نظموں، ان کے شعروں کا پیام یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملیں اور پوری دنیا میں امن قائم ہو سکے۔ جبکہ یہ امن و سکون کی فضا اور جنگوں کا خاتمہ استعماری طاقتوں کو قبول نہیں کیونکہ اس صورت میں ان کی من مانی کا کھیل ختم ہو جائے گا۔امن کے اس پیام کو جاوید انور نے زیتون کی شاخ اور فاختہ کے علامتی اظہار کی شکل میں یوں بیان کیا ہے:

میری تحریروں کا محور ایک بے سر فاختہ
میرا نعرہ خامشی، میرا پیمبر فاختہ
تیرے رستوں کی رکاوٹ شاخ اک زیتون کی
تیرے ایوانوں کے اندر جاگتا ڈر فاختہ

مندرجہ بالا اشعار عالمی سطح پر ہونے والے سیاسی جبر کے ایک واقعے کو ظاہر کرتے ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں عالمی استعماری طاقتوں نے قبضہ کیا ہوا ہے ان میں ایک فلسطین کا ملک بھی ہے۔شاخِ زیتون فلسطین کے تاریخی استعارے کا اظہار بھی ہے۔

جاوید انور کی نظموں میں مغربی استعماریت کے خلاف بھرپور مزاحمت ہے۔عالمی سیاست اور بین الاقوامی سطح پر بنیادی انسانی حقوق کے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ فلسطینی جلاوطن کا گیت، ایک مصلوب آواز، استغراق، خوف، رات کی حمد، ضمیر کو لوری، خدا جانتا ہے، امریکہ میں رات کے آٹھ بجے ہیں، گونگی تتلی، ہم کہ ہیرو نہیں اور اشکوں میں دھنک، جاوید انور کی ایسی نظمیں ہیں جن سے عالمی سطح پر ان کا سیاسی شعور اور گہری بصیرت جھلکتی ہے۔

مسئلہ فلسطین پر ان کی ایک اور نظم "فلسطینی جلاوطن کا گیت" اس بے بس قوم کا نوحہ ہے جو اسرائیلی قبضہ گروں کی وجہ سے دربدری پر مجبور ہے اور اپنے ہی گھر میں ہجرت کا دکھ جھیل رہی ہے۔انسانی حقوق کی نام نہاد عالمی تنظیمیں اس ظلم پر خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہیں کیونکہ ان کے مفاد ظالموں کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے ہاں انسان ہونے کا حق بھی انھی کو حاصل ہے جنھیں وہ اجازت دیں۔ نظم کا آغاز ان مصرعوں سے ہوتا ہے:

میں جانتا ہوں
کہ بھیک میں اسلحہ کے ہمراہ گالیوں اور ٹھوکروں کی کڑی شرائط ہیں
دیکھتا ہوں میں اُن کو جن کے گلے پٹوں میں ہیں
اور بندوق نرم بستر پہ سو رہی ہے
اُداس مت ہو مرے فلسطیں
ابھی تو میری رگوں مس بہتی تمازتیں تیری حرمتوں کا غلاف ہیں
میری ساری سمتیں ترے بدن پر لکھی ہوئی ہیں
تجھی سے ہوں میں
میں تیری عریانیوں کو اپنے لہو کی چادر سے ڈھانپ لوں گا

اُداس مت ہو
دعا کا تعویذ میں نے صحرا میں گم کیا ہے!
خدا اگر ہے تو آ کے دیکھے
زمیں خداؤں سے بھر گئی ہے
زمیں خداؤں میں بٹ رہی ہے
ہماری آنکھوں پر اپنے حصے کے پھول تکنا بھی جرم ہے
اُن گھروں میں رکھی صراحیاں ہم کو رورہی ہیں
کہ جن کے دروازے ہم پہ کھلتے ہیں تو دھماکے
چھتوں کو فرشِ اداس تر کے سپرد کرتے ہیں
آنسوؤں کا ہجوم ہے اور ہم کہ رونا بھلا چکے ہیں

بڑا ادب اور بڑی شاعری وہ ہوتی ہے جو انسانیت کا درس دے اور تمام تعصبات سے اوپر اٹھ کر بنیادی انسانی مسائل اور ان کے حل پہ بات کرے۔ جاوید انور کی شاعری اور ان کے نظریات میں احترام انسانیت اور توقیرِ آدمیت سب سے بڑا پہلو ہے۔ ان کی ہمدردی صرف اپنی قوم اپنے ملک کے لیے نہیں تھی بلکہ ظلم کی چکی میں پستے انسانوں کے لیے تھی خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی موجود ہوں۔ انھوں نے انسانیت کے کرب اور دکھ کو محسوس کیا اور اسے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ایک اچھے انسان کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنی تمام جبلتوں اور ہر قسم کے تعصبات و تفریقات سے اوپر اٹھ کر حق کا ساتھ دے۔ جاوید انور کی شاعری کسی ایک خطے کے لوگوں کی شاعری نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں، ان سب کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ان کی نظم ایک مصلوب آواز آزادی کے لیے لڑنے والے دنیا کے سبھی انسانوں کے نام ہے:

میں سورج ہوں
اور رات کی کوکھ سے پھوٹتی رات کو ہار منوا کے پیدا ہوا ہوں
میں کشمیر، افریقہ، کمپوچیا، ویت نام اور فلسطیں میں پیدا ہوا ہوں
اذاں میرے کانوں میں بندوق سے دی گئی ہے
سُنو، تم کہ جو میری ہی بہتری کے لئے
میرے اپنے صحت مند اعضاء کو مجھ سے جدا کر رہے ہو
مجھے میری ہی زندگی سود پر قرض دینے والو، سُنو
میں تمہارے سبھی فیصلے مانتا تو ہوں، لیکن
مجھے حکم سننے کی عادت نہیں ہے
مجھے رحم سہنے کی عادت نہیں ہے

تم اخبار کی آنکھ میں اپنے آنسو سجاؤ
میں بم کی زباں سے تمہارے بیانوں پہ ہنستا رہوں گا

نظم کے اختتام پر جاوید انور اُس مصلوب آواز کو بلند ہوتا دکھاتے ہیں کہ اب وہ مزید خاموش نہیں رہے گی، اخباری بیانوں اور عالمی طاقتوں کے جھوٹے وعدوں سے نہیں بہلے گی، بلکہ اپنے حق کے لیے خود اٹھ کھڑی ہوگی۔خواہ اس کوشش میں اُسے بندوق ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے، اپنے دفاع کے لیے وہ یہ حق ضرور استعمال کرے گی۔

سنو، قہقہوں کی دُھنوں پر تمہارے سبھی ماتمی گیت
میری سماعت میں محفوظ ہیں
میں یو-این کی آرام دہ کرسیوں میں سجے کارٹونوں کو پہچانتا ہوں
میں سب جانتا ہوں
وہ جو فائلوں میں ہے
اور وہ بھی جو چند کمروں میں سرگوشیوں تک ہی محدود ہے
اب میں اپنے سبھی فیصلے خود کروں گا
کہ میرے بدن پر لگے زخم اب گولیوں کو جنم دے رہے ہیں
سنو، اب میں بندوق کی آنکھ سے دیکھتا ہوں!

جاوید انور کی تیسری کتاب ''بھیڑیے سوئے نہیں'' تک آتے آتے ان کی شاعرانہ آواز بلند اور نڈر ہوتی گئی ہے۔ان کے شعری سفر میں باقی کتابوں کی نسبت یہ کتاب بلند آہنگ اور اونچا لہجہ رکھتی ہے۔اس کتاب میں جاوید انور کا سیاسی نقطہ نظر ایک اخلاقی قدر بن کر ان کی پوری شاعری کو ایک مخصوص فضا فراہم کرتا ہے۔صدیوں سے چلی آرہی غیر انسانی تفریق پر وہ دکھی رہتے ہیں اور دنیا بھر میں جہاں کہیں ایسی صورت حال دیکھتے ہیں، اس پہ بات کرنے سے خود کو روک نہیں پاتے۔

جاوید انور ،انسان کو انسان ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور اس بات پر شدید غمزدہ ہوتے ہیں کہ انسان خود اپنی عزت کرنا بھی بھول گیا ہے۔اس نے زنجیر کو پیر کی رکاوٹ قبول کرکے توڑنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ان کی نظموں میں انسانی ہمدردی ہے اورانسانوں کے ایک دوسرے کے استحصال پر غم وغصہ بھی موجود ہے۔عوام کو ظلم و استبداد کا احساس دلانے کی کوشش میں کہیں کہیں وہ شدید بے بس بھی نظر آتے ہیں۔کہیں ان کا لہجہ حزنیہ ہے، کہیں اس میں افسوس اور بے بسی کی کیفیت ہے اور کہیں کہیں ان کا بلند آہنگ جھلکتا ہے۔ان کی حساس فطرت ظلم اور استحصال کو برداشت نہیں کرپاتی اور ردِ عمل میں احتجاجی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ایسی ہی کیفیت میں انھوں نے ہر ظالم کو بھیڑیے سے تشبیہ دی ہے۔

بھیڑیا ایک ایسا جانور ہے جو اپنے ہم جنس جانور کو بھی کھانے سے دریغ نہیں کرتا۔بھیڑیا ایک آنکھ سے سوتا ہے اور دوسری آنکھ کھلی رکھتا ہے۔جب ایک آنکھ کی نیند پوری ہو جائے تو پھر دوسری آنکھ کی نیند پوری کرتا ہے۔اسے اپنے ہم جنسوں سے خطرہ رہتا ہے کیونکہ زخمی یا کمزور بھیڑیے کو دوسرے بھیڑیے مار کر کھا جاتے ہیں۔بھیڑیے کے بارے میں کہا

جاتا ہے کہ اگر بھیڑیوں کا ریوڑ کسی انسان پر حملہ کرے، اور وہ انسان جوابی حملے میں کسی بھیڑیے کو زخمی کر دے تو باقی بھیڑیے اس انسان کو چھوڑ کر زخمی بھیڑیے کو کھا جاتے ہیں۔

بھیڑیوں کی ان صفات کی وجہ سے جاوید انور نے ہر خود غرض، ظالم، وحشی اور پر تشدد انسان کے لیے بھیڑیے کو علامتی اظہار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی کتاب بھیڑیے سوئے نہیں اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ اس دنیا میں ہر ظالم اور جابر طاقت بھیڑیے کی طرح ایک آنکھ کھلی رکھتی ہے کیونکہ اسے اپنے جیسے دوسرے طاقتور سے خطرہ ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ ادھر اُس کی آنکھ لگی، اُدھر باقی بھیڑیوں نے اس کا کام تمام کیا۔ اپنی ایک نظم استغراق میں کہتے ہیں:

بھیڑیے ہیں، بھیڑیے ہی بھیڑیے ہیں
بھیڑیے ہیں شہر میں، شہروں کے قبرستان میں
کتبوں کے پیچھے خامشی کی اوٹ میں، نعرے ہیں وحشی خوف کے
اوپر خدا ہے، دیکھتا ہے اپنی تنہائی، اداسی، درد، خواہش، خوف، غصہ، جسم
جنت یا جہنم،
بھیڑیے ہی بھیڑیے ہیں، میں نہیں ہوں

بھیڑیوں کی اس بہتات میں، زمینی خداؤں کے اس سیلاب میں خدا دیکھتا ہے، دیکھ رہا ہے انسانوں کے مختلف جذبات، مخلوق خدا کے حالات، مخلوق جو اللہ کا کنبہ ہے۔ جاوید انور نے گویا یہاں خدائی فوجداروں اور زمینی آقاؤں کے پیدا کردہ ماحول میں انسان کی بے بسی کی تصویر کھینچی ہے۔ ڈاکٹر امجد طفیل اپنی کتاب "ہم عصر اردو شاعری" میں جاوید انور کی نظموں میں شامل عالمی استعماریت کے خلاف احتجاجی اظہار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "معاصر سیاسی و سماجی صورت حال ابتدا ہی سے جاوید انور کو اپنی طرف کھینچتے رہے ہیں۔ سماجی ناانصافی اور استحصالی رویے اُس کے اندر غصہ بھر دیتے ہیں۔ اُس کی نظموں میں جو غصے کی زیریں لہریں پڑھنے والے کو اپنی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کا سبب سیاسی و سماجی جبر کے سامنے فرد کی بے بسی اور لاچاری ہے۔ موجودہ کتاب میں سیاسی و سماجی جبریت کے خلاف شاعر کے تخلیقی ردِ عمل کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوا ہے۔ اب وہ عالمی استعماری قوتوں کے طرزِ عمل کے خلاف کھل کر اپنے غصے اور جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ خاص طور پر ۱۱/ ۹ کے بعد امریکی استعمار کی چیرہ دستیاں اس کے اندر شدید ردِ عمل پیدا کرتی ہیں۔ اس نوعیت کی نظموں کا آغاز "دھند میں لپٹی دعا" سے ہوتا ہے۔"(۹)

دھند ہے
دھند ہے اور رات ہے
بھیڑیے سوئے نہیں

روشنی کی اک کرن جو سانس کی اندھی گپھا میں
دھڑکنوں کی جھاڑیوں میں سرسراتی ہے
اسے سورج بنا
اے خدا
بے حسی کی منجمد جھیلوں کو آتش بار کر
میرے دل سے کابل و بغداد تک
دھند ہے
دھند ہے اور رات ہے
بھیڑیے سوئے نہیں

یہ نظم عالمی سیاسی منظر نامے کو بیان کر رہی ہے جس میں دھند، رات اور اندھیری گپھا تاریکی اور ظلمت کی علامت ہے۔ یہ تاریکی دنیا کی بڑی طاقتوں کی پیدا کردہ ہے، جنھوں نے انسان اور انسانیت کے لیے اس دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا خون بہا کر بھی ان بھیڑیوں کی پیاس نہیں بجھی۔ کابل سے لے کر بغداد تک، عراق، افغانستان، کشمیر اور ہر وہ خطہ زمین جہاں انسانیت سسک رہی ہے، وہاں دھند ہے اور دعائیں بھی اسی دھند میں لپٹی ہوئی ہیں۔ گویا یہ شاعر کی بے بسی کا اظہار بھی ہے کہ ان عالمی بھیڑیوں کو روکنے والا اور ان سے ٹکر لینے والا کوئی نہیں۔ بس احتجاج کے کلمات ہیں یا بے بسی میں مانگی گئی دعا۔

نظم "رات کی حمد" میں جاوید انور بین الاقوامی سطح پر چھائی ہوئی اسی تاریکی کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رات نے گویا مہیب تاریکی نے ان ظالموں کے کارناموں کو ڈھانپا ہوا ہے۔ دن میں یہ لوگ مہذب ماسک پہنے پوری دنیا میں اپنے آپ کو اخلاقی اور انسانی حقوق کا علمبردار کہتے ہیں اور اپنی اخلاقی قدروں اور منصفانہ اصولوں کے پرچار کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ لیکن رات اان کے چہرے سے نقاب اتار دیتی ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو!

رات ایک پروردگارِ پُر غرور
رات کی مٹھی میں وہ منظر ہے جس کی اک جھلک
کوہساروں میں دراڑیں ڈال دے
کوہساروں سے پرے
بھر بھری مٹی ہے اس کے روگ ہیں
ہنہناتی گھوڑیوں کے سوگ ہیں
آسماں کی راکھ ہے چنگاریوں کا کھیل ہے!

نیند میں ڈوبی ہوئی بستی، ہلاکو خان کی فوجیں، اندھیرا، آگ، کٹتے نرخرے، جلتے ہوئے بچوں کی چیخیں، رقص کرتی داسیاں، بدمستیاں، مٹکے شرابوں کے، سلاخوں پر ٹنگے بکرے، ہلاکو خاں کا جشن!

رات کی وحشت ہلاکو خاں کا خواب
شیر خاں کی کائنات
رات
گیدڑ کا جہاں
رات عیّاری کا دن
رات امریکہ کی بمباری کا دن!

نظم کے اس بند میں شاعر نے رات کے اس خونی منظر کی جھلک دکھائی ہے جس کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ یہ دل خراش منظر تو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دے، اس وحشت و بربریت کے کھیل کو دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو جائیں اور حوصلہ مندوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں۔ بھر بھری مٹی اور ہنہناتی گھوڑیوں کے روگ اور سوگ ان لوگوں کی بے کسی اور شکستگی کی علامت ہیں جو کچھ نہیں کر پا رہے اور چنگاریاں اڑاتے اس کھیل کو دیکھ کر ماتم زدہ لاچار حالت میں بیٹھے ہیں۔ نظم میں شاعر نے تاریخ کے ایک اور سیاہ باب کا ذکر کیا ہے۔ ہلاکو خان جیسے درندے اور اس کی فوجوں نے انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینکا تھا اور کھوپڑیوں کے مینار بنائے تھے۔ وہ جس شہر جس علاقے میں داخل ہوئے وہاں کے رہنے والوں کو اپنے پیروں تلے کچل دیا۔ ان کی فتح کے جشن میں لوگوں کے کٹتے ہوئے گلے، دھڑ سے جدا ہوتے سر، زندہ آگ میں جلتے ہوئے بچوں کی چیخیں شامل تھیں اور وہ اس خونی کھیل میں ناچتے گاتے، شراب کی بوتلیں توڑتے جشن منا رہے تھے۔ ہلاکو خان کے اس ظلم کی کہانی کو شاعر نے اس لیے دہرایا ہے کہ اب موجودہ دور میں بھی یہی کھیل جاری ہے۔ بس کھلاڑی بدل گئے ہیں۔ رات کی تاریکی میں یہ کھلاڑی گیدڑ کی طرح مکاری سے ساز باز کر رہے ہیں۔ رات امریکہ کی بمباری کا دن ہے۔

اس ساری صورت حال میں جو لوگ بے حسی کی چادر اوڑھ کر سو رہے ہیں، ان کے لیے جاوید انور نے "ضمیر کی لوری" بھی لکھی ہے۔ پوری دنیا پر ایک بے حسی چھائی ہوئی ہے۔ حکمران، اقتدار کے رکھوالے، مذہبی رہنما اور ملکی و قومی محافظ سبھی کے ضمیر سو چکے ہیں۔ سب کے پاس اپنی اپنی تاویلیں ہیں، اپنے اپنے بہانے ہیں، ایسے میں کوئی اذان بلند ہوتی بھی ہے تو ضمیر اپنی میٹھی نیند سے نہیں جاگتا۔

"خدا جانتا ہے"، جاوید انور کی وہ نظم ہے جس میں عالمی سیاست میں امریکی استعماریت کے خلاف احتجاج بڑا واضح اور بلند ہے۔ تیسری دنیا کے جن ممالک میں امریکہ وسائل کے ذخائر دیکھتا ہے، ان پر قابض ہونے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کرتا ہے۔ سپر پاور بننے کا نشہ امریکہ کے حواسوں کو قابو میں نہیں رہنے دیتا۔ اس نے دنیا میں جنگیں بپا کیں تاکہ لوگ انھی میں الجھے رہیں اور ہتھیاروں کے شور اور بارود کے دھوئیں میں یہ غریب ممالک ترقی کی کسی اور شاہراہ کا راستہ نہ دیکھ سکیں۔ ان جنگوں میں امریکہ نے اپنے بھی ڈھیروں فوجی ضائع کیے اور بہت سوں کو نفسیاتی مریض بنایا۔ مارنے والے مرنے والوں کی بے بسی کا حال خود بھی نہیں دیکھ پائے۔ جنگوں کے نفسیاتی اثرات کا ذکر بھی شاعر نے اس نظم میں کیا ہے کہ

ایک طرف اگر مفتوح لوگ نقصان اٹھاتے ہیں تو دوسری طرف خود قابض اور فاتح بھی ان خونی مناظر کو ذہنوں سے نکال نہیں پاتے اور خوابوں میں ڈرتے ہیں۔

نظم کا ایک بند اس کہانی کو صاف الفاظ میں بیان کرتا ہے:

خدا جانتا ہے کہ تیل بھی کھیل ہے اور فلسطین بھی اک تماشا ہے
اصلی تماشے کا حصہ جسے دیکھنے والے یاوہ ہیں، جو قصرِ ابیض میں چرغے اڑاتے
ہیں یاوہ ہیں جن کی زبانوں پہ چھالے ہیں ہاتھوں میں رعشہ خدا جانتا ہے
خدا جانتا ہے کہ طاقت کا مرکوز مطلق وہ خود ہے (نہ مشرق نہ مغرب) زمیں پر اگر
کوئی
فرعون آئے (کہ نمرود) بارود بنتی ہے گندھک، جو یرقان لگتی ہے، بیمار ہاتھوں کو
تلوار کرتی ہے نفرت، خدا جانتا ہے
خدا جانتا ہے کہ دو طرفہ نقصان جنگوں میں ہوتا ہے، دو طرفہ نقصان یک طرفہ
جنگوں میں
ہو تو وہ فاتح، جو فاتح سمجھتے ہیں خود کو وہ ہارے ہوئے لشکروں کے بھگوڑے کماں دار
ہوتے ہیں خوابوں میں ڈرتے ہیں، راتوں کو سوتے نہیں ہیں، خدا جانتا ہے!

سامراجی نظام نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے عوام کو الجھا دیا ہے۔ امریکی استعماریت نے پوری دنیا کو جس طرح غلام بنالیا ہے اور عالمی منڈی میں ہر چیز کی قیمت لگائی ہے، اس کے سیاسی اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی اثرات بھی بہت بھیانک ہیں۔ یو۔ این۔ او جیسا ادارہ جس کا کام عالمی سطح پر امن کو یقینی بنانا، دفاعی مسائل کو حل کرنا اور مختلف ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنا ہے، امریکہ کی اجارہ داری پر منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھا رہتا ہے۔ امریکہ خود کو خدائی مرتبے پر فائز کر کے پوری دنیا کے رزق کو اپنے قبضے میں کرنے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ اور جو ملک امریکہ کو خدا ماننے سے انکار کر دے یا اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑا ہو، اسے منہ کے بل گرانے میں دیر نہیں کی جاتی۔ جاوید انور نے امریکی سامراجیت کا یہ چہرہ اپنی نظم "امریکہ میں رات کے آٹھ بجے ہیں" میں صراحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ کا یہ دعوی ہے کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، سورج چڑھے یا ڈوبے، ڈالر کبھی غروب نہیں ہو گا۔ امریکہ حکم دیتا ہے اور ہم دم سادھے سنتے ہیں۔ ہم کی تشریح میں انھوں نے ان سب ممالک کو شامل کیا ہے جن میں امریکہ سے ٹکر لینے کی جرات نہیں۔ اگر کبھی کوئی یہ جرات کر بھی لے تو وہ آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی، بلکہ خود چیخنے والوں کے پھیپھڑے زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور اس سارے منظر میں یو این او کا کردار یہ ہے کہ وہ خاموش تماشائی بن کر بیٹھا رہتا ہے۔

ان مایوس کن حالات کے باوجود ایک امید ایک سوتے جاگتے خواب پر سب زندہ ہیں۔ شاعر ان حالات میں بھی عالمی استعمار کو شکست دینے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس خون آشام بلا کو مارنے کے خواب۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی کے ہتھیاروں

سے اسے ہرانے کی کوشش ہم ضرور کریں گے۔ ابھی یہ بات اگرچہ ناممکن سی لگتی ہے لیکن ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ اس عفریت پر قابو پالیں گے۔ ہم اپنے آپ کو اس دیو کی قید سے چھڑوالیں گے۔ نظم ''سوتا جاگتا خواب'' بجھے ہوئے کوئلوں میں سلگتی چنگاری کی طرح انتقامی جذبے کی طاقت سے بھرپور نظم ہے۔

تو جو خود کو دنیا بھر کے دستر خوانوں کا مہمان سمجھتا ہے، جو
ننھے منے بچوں کے پیٹوں سے لٹکتی انتڑیاں
دیکھ کے ہنستا ہے،
اور کہتا اور سمجھتا ہے، یہ دنیا تیری ہے،
تجھے ماریں!

آگے چل کر نظم کے چوتھے بند میں جاوید انور لکھتے ہیں:

تجھے ماریں!
دل کہتا ہے
مل جُل کے تجھے ماریں!
اور ماریں گے تجھے تیرے اپنے ہتھیاروں سے، تیرے جہازوں، تیرے بموں،
تیری بندوقوں، تیرے ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں سے تجھے ماریں گے!

جاوید انور کی ایک اور نظم '' انتباہ '' بھی عالمی عفریت کو آنے والے حالات اور نتائج دکھانے کی ایک کوشش ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ابرہہ کے کعبہ پر حملے کے مشہور تاریخی واقعے کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ مذموم مقاصد رکھنے والے لشکر کو قدرت جب ہرانے پر آئی تو ننھی ننھی ابابیلوں کے کنکروں سے نیست و نابود کر دیا۔ شاعر کہتا ہے کہ ظالم ہاتھی والو اگرچہ تم ابھی ہیبت اور طاقت کا پہاڑ ہو اور تمہارے سامنے یہ سب مظلوم کسی کھاتے میں نہیں لیکن ابابیلیں ابھی زندہ ہیں۔ یہ اپنی چونچوں میں کنکر لے کر تم پر حملہ کرنے کو پلٹ آئیں تو تمہیں کہیں بھاگنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ ان کے دلوں میں پنپتی نفرت ان کے حوصلوں کو بلند کر دے گی اور ان کے اعصاب کو مضبوط بنا دے گی اور وہ دن ابرہہ کی موت کا ہو گا۔

جاوید انور کی شاعری اور ان کے شعری نظریات کا نچوڑ جس نظم میں نظر آتا ہے وہ ان کی سگنیچر نظم ''ہم کہ ہیرو نہیں'' ہے جو ان کی دوسری کتاب (اشکوں میں دھنک) میں شامل ہے۔ یہ نظم قومی اور بین الاقوامی سطح کی سیاست اور عام آدمی پر اس کے اثرات کی مکمل نمائندگی ہے۔ گویا جاوید انور نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ نظم ان کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔

نظم کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے:

ہم خزاں کی غدود سے چل کر

خود دسمبر کی کوکھ تک آئے
ہم کو فٹ پاتھ پر حیات ملی
ہم پتنگوں پہ لیٹ کر روئے

یہ نظم عام لوگوں کی کہانی ہے۔ جب کوئی کہانی چلتی ہے تو دو کردار قابلِ توجہ ہوتے ہیں، ایک ہیرو اور دوسرا ولن۔ لیکن ان دو کرداروں کی کہانی چلانے کے لیے جو خام مال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، وہ عام لوگ ہیں۔ عوام ان کا ایندھن یا رزق ہوتے ہیں۔ شاعر نے نظم میں اسی عوام کی کہانی بیان کی ہے کہ یہ بظاہر بے مقصد اور ناقابلِ توجہ نظر آنے والے لوگ دراصل پورے انسانی نظام کی بنیاد ہیں۔ نظم کا عام آدمی کسی ایک جغرافیہ، مذہب، عقیدے یا نظریے تک محدود نہیں بلکہ شاعر نے ہر مذہب، عقیدے اور جغرافیے کے آدمی کی نمائندگی کی ہے۔ نظم کا آغاز عام آدمی کے جنم سے ہوتا ہے کہ کہ کیسے عام آدمی اس گھٹن زدہ، استحصالی معاشرے میں خود اپنی راہ بناتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ جیسے خودرو پودے جنھیں اپنے جنم کے لیے کسی توجہ یا آرائش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عام آدمی خود ہی پل بڑھ کر اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور خود ہی اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے۔

نظم کے تیسرے اور چوتھے بند میں شاعر نے جبر سے نشاط کو نکالنے کی سعی کی ہے اور مختلف ملکوں اور نظریوں کی مثالیں دے کر اس کوشش کو ثابت کیا ہے۔ پرانی فلاسفی سے جدید عہد کے نظریات تک سب کو سمیٹ کر اس نظم میں بیان کر دیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہم نے اپنے لیے لحاف بُنے
زرد شریان کو دھوئیں سے بھرا
پھیپھڑوں پر سیاہ راکھ ملی
ناگاساکی میں پھول کاشت کیے
نظم بیروت میں مکمل کی
لورکا کو کلائی پر باندھا
ہوچی منہ کو نیام میں رکھا
ساڑھے لینن بجے اسکول گئے
صبحِ عیسیٰ کو شام میں رکھا
ارمغانِ حجاز میں سوئے
ہولی وڈ کی اذان پر جاگے
ڈائری میں سدھارتھا لکھا

دنیا بھر میں جنگ کو ہوا دینا، اسلحہ فروخت کرنے کے لیے منڈیاں تلاش کرنا، طاقتور ممالک کو تقسیم کرنا اور غریب ممالک کو قرض دے کر اپنا غلام بنانے میں امریکہ کا کوئی ثانی نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان مذموم مقاصد کے حصول کے

لیے امریکہ نے ہر حربہ استعمال کیااور دنیابھر میں خانہ جنگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے جاپان کے دوشہروں ہیروشیمااور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تھے۔ ان ایٹمی دھماکوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ مارے گئے اور جو بچ گئے وہ بھی زندہ لاشوں کی طرح تھے۔ نفسیاتی صدمے کے ساتھ ساتھ ایٹمی تابکاری کے اثرات نے ان علاقوں کے لوگوں میں صحت کے کئی خوفناک مسائل پیدا کیے۔ امریکی ایٹمی پروگرام کے اس ظالمانہ اقدام نے جاپان کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جنگ تو ختم ہو گئی لیکن اس تباہی کے نقوش برسوں لوگوں کے جسموں اور ذہنوں پر باقی رہے۔ ناگاساکی میں پھول کاشت کرنا، گویا موت سے زندگی کو اگانا ہے۔ کیونکہ ناگاساکی میں ایٹمی دھماکوں نے زندگی کے سبھی شواہد ختم کر دیے تھے۔ ایسی مردہ جگہ پر پھول اگانے کی بات کرنا، شاعر کی مثبت سوچ اور تخلیقی رجحان کا اظہار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم عام لوگ سیاسی و سماجی طور پر تباہ شدہ معاشرے اور جنگ سے ویران علاقوں میں بھی زندگی کے آثار ڈھونڈ لیتے ہیں اور پھر سے نمو پانے لگتے ہیں۔ بیروت، لبنان کا ایک جنگ زدہ علاقہ ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کی خانہ جنگی نے اس علاقے کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ ایسی جگہ جہاں کی فضا بارود کے دھوئیں اور گولیوں اور توپوں کی گھن گرج سے آلودہ اور ہراساں ہو، وہاں نظم کی تخلیق کسی معجزے سے کم نہیں۔ نظم کی تخلیق انسان کے خواب کے زندہ رہنے کی علامت ہے۔

آگے چل کر شاعر نے دنیا بھر کے بڑے بڑے مذاہب اور عقائد و نظریات سے منسلک لوگوں کی ترجمانی کی ہے۔ گارسیالورکا، اسپین کا ایک انقلابی شاعر، ڈرامہ نویس اور مصور تھا۔ وہ ایک انسان دوست شاعر تھااور اس کی شاعری آمریت سے نفرت اور آمرانہ فیصلوں پر احتجاج تھی۔ تاہم ایک بے باک اور نڈر تخلیق کار ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنازع کا شکار رہا۔ آمریت کے جبر میں محبت و انسانیت کا پرچار کرنے والے اس شاعر کی موت بھی ایک تنازع تھی۔ اس کے بارے میں عام طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران وہاں کے ڈکٹیٹر فرانسکو فرانکو کے حامیوں نے اسے گولیاں مار کر ختم کر دیا تھا۔

ہوچی من ویت نام کی کمیونسٹ پارٹی کا چیئرمین تھا۔ وہ سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور مصنف بھی تھا۔ فرانس نے ویت نام پر قبضہ کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اسے منہ کی کھانا پڑی۔ پھر امریکہ نے اس میں اپنا حصہ ڈالا اور ویت نام کو شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم کر دیااور لاکھوں لوگوں کا قتلِ عام کیا۔ ایسے میں ویت نام کے باسیوں کو اس جنگ کا مقابلہ کرنے کی ہمت دینے والا ایک سیاسی رہنما اور لیڈر ہوچی منہ اٹھ کھڑا ہوااور اس قوم نے خود پر حملہ کرنے والوں اور اپنے گھر میں گھسنے والوں کو ذلیل وخوار کر دیااور وہ وہاں سے واپس نکل آنے پر مجبور ہو گئے۔

ولادیمیر لینن کا تعلق روس سے تھا اور وہ ایک انقلابی اور اشتراکی سیاست دان تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ روسی سوویت سوشلسٹ پارٹی کا پہلا صدر بھی تھا۔ لینن روس کی اشتراکی مدور جماعت کا سرگرم رکن بھی تھا۔ بائیں بازو کے ایک انقلابی ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی سیاسی طور پر خاصی سرگرم رہی۔ شاعر نے نظم میں لینن کے اس ذکر سے مارکسیت اور سوشلزم کے نظریے کی بات کی ہے۔

نظم کے اس بند کے آخری مصرعوں میں شاعر نے صبحِ عیسیٰ اور ارمغانِ حجاز کا ذکر کر کے دنیا کے دو بڑے مذاہب

عیسائیت اور اسلام کے ماننے والوں کی بات کی ہے۔ ہولی وڈ کی اذان سے مراد جدید مغربی فکر ہے اور سدھارتا بدھ مت کی نشانی ہے۔ گویا اس پورے بند میں مختلف مذاہب، عقائد اور نظریات کو اکٹھا کر کے عام آدمی کے الگ الگ پہلوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ یہ عقائد و نظریات جہاں آدمی کے لیے اس دنیا میں مقصدِ زندگی طے کرتے ہیں، وہیں عام آدمی ان کے ہاتھوں کھیلا بھی گیا۔ عوام کی نفسیات کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے سیاسی و مذہبی آمروں نے بھی کئی حربے آزمائے۔ لیکن عام آدمی نے ہر دور میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ بھی تلاش کر لیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک اس دھرتی پر کوئی ایک بھی انسان زندہ ہے، امید زندہ رہے گی۔ عام آدمی نہ تو ہیرو ہے اور نہ ہی ولن لیکن وہ ان دونوں کرداروں سے زیادہ اہم اور بڑا کردار ہے۔

حاصلِ کلام:

جاوید انور کی شاعری جن موضوعات کے گرد گھومتی ہے ان میں ریاست کے مقتدر طبقے کی مطلق العنانی، ریاستی باشندوں کی جدوجہد، آمریت سے نکل کر جمہوریت کی راہ پر گامزن ہونے کا سفر اور اس میں در پیش آنے والے مصائب و مشکلات، چند طاقتوں کی اجارہ داری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی بدامنی، انسانوں کا استحصال اور انسانیت کی تذلیل شامل ہیں۔ ان کی شاعری نہ تو سیاسی نعرہ بازی ہے نہ کسی خاص سیاسی نظریے کی تبلیغ و ترویج، بلکہ ایک عام انسان کی زخمی روح کا نوحہ اور اس کے احساسات و فکر کی عکاسی ہے۔ انسانیت کا آفاقی درد اور ہمدردی کا جذبہ ہے۔ ان کی نظموں میں فکر کہیں قنوطیت کا رنگ پکڑ لیتی ہے اور کہیں رجائیت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ یہ شاعر کی بلکہ اس دور کے ہر آدمی کی ذہنی کشمکش کی عکاسی ہے۔ مجموعی طور پر جاوید انور کی نظمیں اپنے عہد کے سیاسی ماحول اور ان کی سیاسی بصیرت اور شعور کی آئینہ دار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شان الحق حقی:(مرتبہ)”فرہنگ تلفظ“مقتدرہ قومی زبان،پاکستان،۲۰۰۸ء،ص۶۴۸

۲۔ ڈاکٹر سید انوار الحق حقی؛وہاشم قدوائی(مرتبین):”جدید سیاسی فکر“ترقی اردو بیورو نئی دہلی،۱۹۸۱ء،ص۷

۳۔ ڈاکٹر اعجاز حسین:”ادب اور ادیب“اسرار کریمی پریس،الہ آباد،۱۹۶۰ء،ص۳۵۴

۴۔ ایضاً،ص۳۷۲

۵۔ سلمان صدیقی:(مضمون)”جاوید انور، تقریب رونمائی بسلسلہ کتاب اشکوں میں دھنک“شیزان مال روڈ لاہور، ۱۵مئی۱۹۹۴ء

۶۔ ڈاکٹر محمود شیخ:(مضمون)”ادب اور رومان“مشمولہ ”ماہنامہ پیش رفت“(مدیر) ڈاکٹر سید عبدالباری، دہلی ، ۱۹۹۷ء،ص۳

۷۔ رشید امجد:” شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، کوٹھی رتن چند،(رتن باغ)“طیب اقبال پرنٹر لاہور،۱۹۹۳ء،ص۳۵

۸۔ خالق تنویر:”اختر حسین جعفری سے ایک گفتگو“مشمولہ ”فنون“ شمارہ نمبر ۳۸، جنوری تا اپریل،(مدیر)احمد ندیم قاسمی،۱۹۹۳ء،ص۳

۹۔ اختر انصاری:(مضمون)”ادب اور سیاست“ مشمولہ ”رسالہ ”منزل“لکھنو،۱۹۴۴ء،ص۴

۱۰۔ ڈاکٹر امجد طفیل:”ہم عصر اُردو شاعری“سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۳ء،ص۲۷۹

باب سوم
جاوید انور کی نظموں میں سماجی شعور

باب سوم

جاوید انور کی نظموں میں سماجی شعور

ادب اور سماج:

ادب اور سماج کا تعلق بہت پرانا ہے گویا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب سماج کے بغیر نہیں پنپ سکتا، یہ کسی بھی طرح معاشرے اور اس کی اقدار و روایات سے بالکل لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ ادب برائے ادب کا نظریہ بہتر ہے یا ادب برائے زندگی، یہ بات تو بہر حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ادب سماج سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ہاں البتہ سماج کی اقدار کو ارفع بنانے کے لیے ادب ایک مبالغہ آمیز ماحول ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ ایک سچا ادیب یا شاعر اگر اپنی انفرادی خواہشات اور خیالات کو ہی سامنے لائے تب بھی اس کی شخصیت اس کی قوم اور معاشرتی تہذیب کے زیرِ اثر ہی پروان چڑھی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب معاشرے کا ایک وسیلہ اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر کے لیے شعری محرکات میں اس کے ارد گرد کا وہ ماحول ہوتا ہے جس میں وہ پروان چڑھتا ہے اور وہ پیمانے جن کے مطابق وہ اپنے معاشرے کو دیکھنا چاہتا ہے۔

انسانی ذہن اپنا مواد اپنے ماحول اور ارد گرد کے حالات سے اکٹھا کرتا ہے۔ یہ حالات مختلف سیاسی و سماجی حالات اور رسوم و رواج کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اردو شاعری نے ہر عہد کے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ کسی سماج میں مذہب، طرزِ فکر، طرزِ بود و باش، رسم و رواج، طریقہ تعلم، تفریحات، فن اور اس طرح کے کئی دیگر ثقافتی عناصر مل کر اس سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ تمام سماجی پہلو اس دور کے ادب اور شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔

> "سماج انسانوں کے خلق کردہ سیاق کا نام ہے۔ مختلف ادارے، جمعیتیں اور معائر مل کر جس سماج کے نام سے ایک باہم متعلق کل Integrated whole کی تشکیل کرتے ہیں، اسے دوسرے لفظوں میں بین الانفرادی رشتوں سے گتھی ہوئی تنظیم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ سماج بہ ظاہر جتنا واضح، نمایاں اور ٹھوس دکھائی دیتا ہے، اس سے زیادہ اس کی صورت پیچیدہ، دھندلی اور تجریدی ہے۔ وہ ایک تہذیبی تشکیل بھی ہے، تاریخی تشکیل بھی اور مارکس کے لفظوں میں اقتصادی تشکیل بھی، موجودہ وقتوں میں ہم اسے سیاسی تشکیل کا نام بھی دے سکتے ہیں اور پاور کی تشکیل کا بھی۔"(۱)

شاعری کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اگرچہ شعر کا پہلا تاثر اس سے لطف لینا ہے لیکن اگر اس سے سماج کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ سماجی اقدار کا ترجمان بنتا ہے تو اس کا اثر دیرپا رہتا ہے۔ اگر کسی دور کی شاعری میں اس دور کے سیاسی و اقتصادی مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہو تو اس شاعری کی افادیت زیادہ ہوتی ہے اور وہ زندہ رہتی ہے۔ جدید شاعری کی فکری روایت میں فرد کے خدشات، انتشار اور شکست و ریخت اس کی ذات تک محدود نہیں بلکہ سیاسی و سماجی سطح کو

بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ سماجی حقیقت پسندی کے بغیر کوئی ادب زندہ نہیں رہتا نہ ہی معیاری ہو سکتا ہے۔ ہر ادیب اور شاعر سماج کا ایک فرد ہے اور سماج کے مطالبات سے متاثر ہوتا ہے، سو وہ زندگی کے مسائل کو ہی موضوع بناتا ہے۔

"زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں۔ سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراکِ عمل کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔ اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے۔ ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہیں اور سماج کی ابتدا اس غرض سے ہوئی ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی رہے۔ سماج میں ادب کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔"(۲)

بحیثیت انسان، کسی معاشرے کی ترقی و بہتری کے لیے جو کوشش کسی بھی انسان کو کرنی چاہیے، وہی ادیب کے لیے ضروری ہے۔ تاہم اس پر دوہری ذمہ داری بھی ہے کیوں کہ وہ ایک حساس ذہن اور تخلیقی انسان ہونے کی وجہ سے نقاد کی حیثیت سے سماج کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ ایک سچا ادیب کبھی اس سماجی ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے، زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلتی ہے اور سماج ایک طویل اور مستقل تبدیلی سے گزرتا ہے۔ ایسے میں ادیب کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس بدلتے سماج کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش کرے۔

"زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے"(۳)

شاعری میں اگرچہ غزل گو شعرا نے بھی سیاسی و سماجی شعور کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے تاہم نظم کا سماج اور معاشرے سے تعلق اس لحاظ سے مضبوط ہے کہ یہ اپنے اندر ایک وسیع موضوع سمیٹنے اور اس کے ہر پہلو کو کھولنے کی گنجائش رکھتی ہے۔ نظم جذبات کے وقتی پن کو ایک دیرپا احساس میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں نظموں کا دامن سماجی شعور اور مسائل سے آگاہی کے لحاظ سے بھرا ہوا ہے۔ الطاف حسین حالی سے شروع ہونے والی نیچرل نظموں نے انجمن پنجاب سے نکل کر ایک لمبا سفر کیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ محمد اقبال کی فکری اور نظریاتی نظمیں ہوں یا فیض کی انقلاب پسند رومانی نظمیں، نظیر اکبر آبادی کی "روٹی" اور آدمی" جیسی عام فہم نظمیں ہوں یا حبیب جالب کی صدائے احتجاج بنتی باغی نظمیں، ہر دور کے نظم نگاروں نے اپنے اپنے دور کے حالات اور مسائل کو اپنے نظریات کی روشنی میں نظم کا موضوع بنایا ہے۔ نظم کی مقصدیت اور اہمیت کے حوالے سے رشید امجد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"دوسری اصناف کے مقابلے میں نظم مقصدیت کے زیادہ قریب رہی ہے۔ نظیر کا آدمی نامہ ہو یا میر و سودا کے شہر آشوب اور ہجویات، صورتِ حال کی براہِ راست عکاسی کسی نہ کسی حد تک نظم کا خاصہ رہی ہے۔ ۱۷۰۷ء (اورنگ زیب کی وفات) سے ۱۸۵۷ء

(جنگ آزادی کا اختتام) تک کی پر آشوب زندگی، طوائف الملوکی اور اجتماعی شکست و ریخت کے اثرات اگرچہ غزل میں بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں لیکن اس کی مکمل اور براہِ راست تصویریں، شہر آشوبوں اور ہجویات ہی میں دکھائی دیتی ہیں۔۱۸۵۷ء کے بعد مقصدیت کی جس تحریک نے جنم لیااس کے اظہار کے لیے نظم ہی سب سے مؤثر ذریعہ ٹھہری اور آہستہ آہستہ مغربی اثرات کے تحت نظم جدید عہد میں داخل ہوئی۔"(۴)

سماج اور ادب کا تعلق عموماً دوطرفہ ہوتا ہے۔ کبھی ادب زمانے کے مزاج وخیال کو بدلتا ہے اور اس میں ایک نیا ذہنی رجحان پروان چڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی سماج ادب کے معیار کو گھٹاتا اور بڑھاتا ہے۔ ادب کا مواد سماج اور سماجی قدریں ہیں۔ سماجی اقدار وروایات کو ادب بہتر خواہ بنائے یا نہیں، تاہم ان کی ترجمانی بہر حال ادب ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ سماجی زندگی کے یوں تو کئی پہلو ہیں تاہم کسی معاشرے کی تہذیب وتمدن، دراصل اقدار کا وہ نظام ہوتا ہے جس کے تحت ایک معاشرہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ یہ اقدار وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہتی ہیں۔ تاہم ان کی اہمیت کا تعین کسی سماج میں ان کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں فیض احمد فیض نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "میزان" میں سماجی اقدار کے معیار پر تفصیلی بحث کی ہے۔

"یہاں ہمیں ایک خاص خارجی معیار قائم کرنا ہوگا۔ اور یہ معیار سماجی ہے۔ ہم کہیں گے جس قدر کو ہماری سماجی زندگی میں زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہی زیادہ اہم بھی ہے۔ سماجی زندگی میں زیادہ اہمیت کے کیا معنی ہوئے؟ یہ معنی ہوئے کہ جن سے سماجی زندگی کی ہئیت، ترکیب اور تنظیم پر زیادہ اثر پڑے۔ یہ ہئیت اور ترکیب بھی بدلتی رہتی ہے۔ اسی لیے معاشرتی ادل بدل کے ساتھ ان قدروں کی بھی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اور وقت کے مطابق ان کی ترتیب اور نظام میں ترمیم کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر آج کل تمام قدروں کی بنیاد اور سرچشمہ یعنی خود انسانی زندگی معرضِ خطر میں ہے۔ اس لئے موجودہ دور میں ہماری قدروں کا نظام اسی بنیادی قدر پر مرکوز ہونا چاہیے۔"(۵)

جاوید انور کی نظموں میں سماجی شعور:

شاعری اپنے عہد کی ترجمان بھی ہوتی ہے اور نوحہ گر بھی۔ شاعر اپنے دور کی تہذیب، ثقافت، روایات، اقدار اور حقوق کی پائمالی کا ماتم بھی کرتا ہے اور اپنے جیسے انسانوں پر ہونے والے ظلم وجبر اور استحصال کے خلاف آواز بھی اٹھاتا ہے۔ شاعری اگرچہ ایک داخلی واردات ہے تاہم یہ داخلی واردات جس کیفیت میں جنم لیتی ہے، وہ خارجی حقائق سے جڑی ہوتی ہے۔ ایک شاعر اگر فطرت کے حسن کو قریب سے موٹے عدسے کے ساتھ دیکھتا ہے تو وہ معاشرتی بدصورتی کو بھی بہت شدت سے محسوس کرتا اور اس پر نوحہ کناں ہوتا ہے۔ اس کا سماجی شعور اسے کھوکھلے نظام اور بدصورتی پر ڈالے جانے والے پردوں کی پہچان کرا دیتا ہے۔ شاعر معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے انسانی زندگی کے مختلف معاملات اور

افعال، محبت، نفرت، خود غرضی، بے بسی، بے حسی، مجبوری، ظلم اور استحصال کا بغور جائزہ لیتا ہے۔

جاوید انور کی نظمیں فرد اور معاشرے کے درمیان تعلق کو کئی سطحوں پر بیان کرتی ہیں۔ انھوں نے معاشرے کے بنیادی مسائل پر بات کی ہے۔ سیاسی جبر و استحصال کے زیرِ اثر پروان چڑھتا معاشرہ کئی مسائل اور جرائم کو جنم دیتا ہے۔ انسان اس معاشرے میں انسان نہیں بلکہ کنکر اور پتھر بن جاتا ہے۔ راہ میں آ جانے والا کنکر اور جذبات سے عاری پتھر۔

جاوید انور کے دوست اور نظم کے ایک اہم شاعر حسین عابد، ان کی شاعری کے موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مارشل لاء کے زمانے میں جوان ہونے والے اس شاعر کی نظموں اور غزلوں میں جبر، جمود، دہشت اور زندگی کی لایعنیت کی دردمندانہ تصویر کشی ایسی باکمال ہے کہ یہ کہیں بھی یک سطحی بیان، نعرہ بازی یا پروپیگنڈا کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ طالب علمی کے زمانے کے بعد عملی زندگی میں تخلیق ہونے والی اس کی شاعری روزمرہ کی ذلت، معاشرتی منافقت اور بظاہر غیر اہم سمجھے جانے والے عام انسان کے شب و روز کے دکھ سکھ کی بلیغ ترجمانی کرتی ہے۔ اپنا وطن چھوڑ کر ایک غیر ملک کی باشندگی اختیار کرنے کے بعد اس کی شاعری میں ہجرت کرنے والے کے وہ تمام دکھ بہت ہنر مندی سے بیان کیے گئے ملتے ہیں جو اپنی مٹی سے جدا ہونے والے ہر حساس شاعر، ادیب کے ہاں ملتے ہیں۔ اور ان تمام زمانوں سے گزرتے ہوئے وہ محبت کی جادوگری، وصل کی لذت اور جدائی کے درد کے بیان سے کبھی غافل نہیں ہوا۔"(۶)

کسی معاشرے میں جو چیزیں مثبت یا منفی اثرات رکھتی ہیں ان سے انفرادی اور اجتماعی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ اس لیے ایک ادیب یا شاعر اس سے پہلو تہی نہیں برت سکتا۔ وہ بھی ان اثرات کا شکار ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں جنم لینے والے جذبات و احساسات کو شاعری کا حصہ بنا لیتا ہے۔

سماجی مسائل میں ایک طرف اخلاقی قدروں کی پامالی جن میں مختلف مذہبی، مسلکی اور لسانی تعصبات، تہذیبی انتہا پسندی، تشدد، سرِعام قانون شکنی، غنڈہ گردی، قانون ساز اداروں اور انتظامی طاقتوں کی بے حسی اور سرد مہری، حقائق سے پہلو تہی شامل ہیں۔ دوسری طرف افلاس، غربت، بھوک، بے روزگاری، طبقاتی کشاکش اور ان سے جنم لینے والے جرائم اور جہالت اقتصادی پہلو کے ساتھ ساتھ سماج کی اخلاقی سطح کو بھی مسلسل گراتے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہر طرف بدامنی اور انتشار پھیلا ہوا ہے۔ اس کٹے پھٹے معاشرے کی خستہ حالی کو شاعری نے بھی اپنے اظہار میں شامل کیا ہے۔

> "جاوید انور کی فکری اپج اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ سماجی جبر کے شکار انسانوں کو دیکھ کر جھنجھلا جاتے ہیں اور انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہیں کہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر غلامی کی زنجیروں کو اُتار پھینکو۔ جب وہ مجبور اور بے بس انسان کو دیکھتے ہیں تو سوال کرتے ہیں کہ تم نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ ظلم کے خلاف آواز کیوں نہیں اُٹھاتے؟ ان کی نظر میں ایسے انسان "طفلِ معصوم" ہیں جو اپنے حق کے لیے آواز

نہیں اٹھاسکتے۔"(۷)

ایک نظم سے کچھ مصرعے دیکھیے!

بولتا کیوں نہیں، طفلِ معصوم، تُو کب سے بیمار ہے

کیسا آزار ہے، جس نے تیری شبوں سے تری نیند، تیرے دنوں سے

کھلونے چرائے

دیکھتا کیوں نہیں تیرے بابا کے بالوں میں کھجلی ہے اور انگلیاں جھڑ چکی ہیں

حسابِ شب وروز کرتے ہوئے

تیری اماں کے رعشہ زدہ ہاتھ خوش حالیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

اَن دُھلے برتنوں میں پڑے رہ گئے

صبحِ تعبیر نے شاخ پر سبز ہونے کی حسرت لکھی

آنکھ کو موتیا دے دیا!

شاخ پر سبز ہونے کی حسرت کو شاعر نے یوں مکمل کیا ہے کہ جب تعبیر کے دن آئے تو آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ رہیں بلکہ ان میں موتیا اتر آیا۔ سماجی مسائل اور سسٹم کی خرابی نے عام آدمی کی زندگی کو مزید تلخ اور مشکل کر دیا ہے۔ مڈل کلاس گھرانوں اور غریب غربا کی زندگیاں ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے جتن میں، بیماری، مفلسی اور فکرِ معاش سے لڑتے اور اپنے حصے کی خوش حالی تلاش کرتے کرتے بیت جاتی ہیں۔ انجام کار ان کا حال غلام عباس کے افسانہ "کتبہ" کے شریف حسین جیسا ہوتا ہے جو اپنی خواہش کی تکمیل کے خواب دیکھتا مر گیا اور اس کے نام کی تختی اس کی قبر کا کتبہ بن گئی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

دیکھتا کیوں نہیں آج بازار میں جشنِ افلاس ہے

شہر کی بھوک چوری ہوئی

اور خبروں نے اخبار گم کر دیا

سماج میں عام آدمی کو خواب دیکھنے کی سزا یہ ملتی ہے کہ کھلی کھڑکیوں میں سلاخیں اگ آتی ہیں۔ ہاتھ اور دل دونوں زخمی ہو جاتے ہیں۔

جاوید انور کے ہاں فرد کی داخلی تنہائی کا دکھ اور اندرونی کشمکش کا اظہار کئی نظموں کے مصرعوں میں اپنا آپ ظاہر کرتا ہے۔ اس مشینی دور میں انسانی جذبات پہ پڑنے والی برف انسان کی ذہنی صحت اور اس معاشرے کو کس طرح تباہ کر رہی ہے، اس کی کئی تصویریں ان کی نظموں میں موجود ہیں۔ نوزائیدہ سے خطاب ان کی ایسی ہی ایک نظم ہے جو ان کے پہلے مجموعہ کلام "شہر میں شام" میں شامل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ایک نئے آنے والے بچے کے سامنے انسان کے ہاتھوں اس خطے کی تباہی و بربادی کا نقشہ پیش کیا ہے اور اس دنیا کے ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ نئے دور میں نیا شہری تمدن، معاشرتی رجحانات، نئی ٹیکنالوجی اور مادیت نے معاشرے کو جہاں فوائد پہنچائے ہیں وہیں ایک مصنوعی پن بھی پیدا کر دیا ہے۔ انسانی

رشتے اور تعلقات بھی اس مصنوعی پن کا شکار ہوئے ہیں۔

جاوید انور ایک نئے پیدا ہونے والے بچے کو مخاطب کر کے ٹیکنالوجی اور صنعت سے آراستہ اس سیارہ زمین کا سیاہ رخ دکھاتے ہیں۔ یہ سماج، یہ دنیا ویسی نہیں جیسی اپنی تخلیق کے وقت تھی۔ قدرتی ماحول کی اصل خوب صورتی، اس خطے کا امن و سکون اور یہاں موجود نعمتیں اللہ نے انسان کے برتنے کے لیے بنائی تھیں لیکن انسان نے اس دنیا کا اصلی حسن تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بظاہر آدمی نے بڑی ترقی کی ہے اور چاند تک پہنچ گیا، دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈالنے لگا، لیکن اس زمین پر فطرت کا پیدا کیا ہو ماحول اور اس کی خوب صورتی کو گہن لگا رہا ہے۔ فیکٹریوں کا دھواں، مصنوعی اشیاء کو سجانے کے لیے قدرتی اشیاء کا ضیاع، درختوں کی کٹائی، ندی نالوں اور دریاؤں میں پھیلائی آلودگی، پہاڑوں اور قدرتی سیر گاہوں میں پھینکا گیا کچرا، سڑکوں پہ دھوئیں کے گہرے بادل اور سماعت کو متاثر کرتی ناگوار آوازیں۔۔۔ غرض یہ کہ ایک لمبی فہرست ہے انسان کے گناہوں کی۔ اس پہ مستزاد انسانوں کا ایک دوسرے پر ظلم و ستم، ہتھیاروں کی گھن گرج اور خطرناک کیمیائی مادوں سے بنائے گئے بم اور بارود۔۔۔ اپنے ہی ہم جنسوں کی نسل کشی اور ان پر ظلم و زیادتی نے اس خطہ زمین کو رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ابنِ آدم نے اس دنیا میں اپنے ہی بھائی کو غلام بنالیا ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی نے معاش کی چکی میں پستے غریب انسان کو اپنے بچوں کو کتابوں کے بجائے مشینوں میں جھونکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ چائلڈ لیبر کے حوالے سے بڑے بڑے دعوے اور نعرے تو نظر آتے ہیں لیکن عملی طور پر ان مفلس خاندانوں اور ان کے ننھے اثاثوں کو بچانے کے لیے کوئی اقدامات نظر نہیں آتے۔ لیکن ان تمام تاریک پہلوؤں کے باوجود ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ ایک امید ہے کہ شاید وہ اس راستے ،اس سفر میں رہزن نہیں رہبر بنے۔ نظم کا بند ملاحظہ ہو!

یہاں سے آگے وہ راستہ ہے
کہ جس پہ انسان چل رہا ہے
کسی ستارے پہ مارٹر گن
کسی جزیرے پہ سُرخ پھولوں کی بارشیں ہیں
کہیں مشیں کی گراریوں میں گلاب سا ہاتھ گھومتا ہے
کسی دھوئیں میں ہیں لعل و گوہر
تمھی ہو اس راستے کے رہبر
تمھی ہو رہزن، تمھی ہو رہرو
اُٹھو کہ تم کو تمہارا رستہ
تمہارا بستہ بلا رہا ہے

سماجی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی بھوکے پیٹ ہو تو تہذیب و اخلاق رخصت ہونے لگتا ہے اور بھوک غالب آکر انسان کے اندر وحشت کو جنم دیتی ہے۔ بھوک تہذیب کے آداب بھلا دیتی ہے اور تمام اخلاقی اصول، مذہبی حدیں اور قانونی پابندیاں بوجھ بن جاتی ہیں۔ انسان بے بس ہوتا ہے تو بے حسی اپنے پر پھیلانے لگتی ہے۔ انسان

کی خودداری مر جاتی ہے اور آدمی چند نوالوں سے پیٹ بھرنے کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ انسانیت کی یہ پست سطح سماج میں پھیلی طبقاتی کشاکش اور پیسوں اور وسائل پر چند لوگوں کی اجارہ داری کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔

جاوید انور کی نظم "نیا تماشا" سے ایک بند ملاحظہ ہو:

ہجوم چپ ہے
ہجوم بھوکا ہے
گالیوں سے شکم بھرے تو تمام سکھ ہے
عجیب دکھ ہے
انہیں سزاؤں کا دکھ نہیں ہے
مگر یہ لقمہ
یہ آخری سانس ہے، نہ چھینو!
یہ ایک لقمہ نہ ان سے چھینو
کہ اس کی خاطر یہ ہاتھ پھینک آئے بھٹیوں میں
یہ اپنی بینائی بیچ آئے
انہیں خبر کیا کہ کون ننگا ہے
کس نے کپڑے پہن رکھے ہیں
انہیں خبر کیا

یہ بے بسی اور بے حسی کا وہ مقام ہے جس پر مفلسی میں مبتلا یہ لوگ تہذیبِ زندگی تک بھلا بیٹھے ہیں۔ سماج کا یہ المیہ جاوید انور کو مسلسل بے چین رکھتا ہے۔ وہ احتجاجی صدا بلند کرتے ہیں اور اشرافیہ کو للکارتے ہیں کہ عام آدمی کی زندگی اور ان کی زندگی کا فرق ایک حساس دل کو بڑا بے چین کرنے والا ہے۔ کہیں پر لوگ سونے کے نوالے کھا رہے ہیں اور کہیں دو گھونٹ پانی تک میسر نہیں۔ قدرتی وسائل کی یہ تقسیم انسان کے حرص اور ہوس کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔ جاوید انور اشرافیہ کے طبقے کو مخاطب کر کے طنز کرتے ہیں:

تمہیں خبر کیا کہ موسموں کا مزاج کیسا ہے
چھاؤں کس بھاؤ بک رہی ہے
تمہاری راہداریاں معطر
تمہارے دالان کے خس و خاک شبنمیں ہیں
تمہیں خبر کیا!
برونِ آب جھیل ہے اور لوگ مینڈک بنے ہوئے ہیں

انسان کو مینڈک سے تشبیہ دے کر شاعر نے انسان کی اُس بدترین حالت کا نقشہ کھینچا ہے جس میں اُسے اس کے

بھائی بندوں نے ہی مبتلا کیا ہے۔لوگوں کی یہ خراب حالت انھیں اب موت کے بجائے زندگی سے خوف زدہ کرتی ہے۔
نظم "چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی" میں جاوید انور لکھتے ہیں:

مگر اے موت،
ہاں اے موت ہم تجھ سے نہیں ڈرتے
ہمارا خوں ملوں کی چمنیوں پر اپنے اصلی رنگ میں لکھا ہوا ہے
دیکھ، ہم ہی تو مشیں میں گریس کی مانند بہتے ہیں
تجھے ہم پاؤں کی ٹھوکر پہ لکھتے ہیں!
ہمیں تو زندگی سے خوف آتا ہے

"موضوعاتی سطح پر جاوید انور کے ہاں تنہائی، زندگی کی بے معنویت اور سماجی جبر کے مقابل فرد کی بے چارگی بار بار اپنا اظہار کرتی ہے۔سماجی ماحول کی جبریت اور خارجی حلات کا شکنجہ اور اب تیسری کتاب تک آتے آتے امریکی استعمار کے مذموم مقاصد کا شکنجہ اسے اپنی گردن کے گرد کسا محسوس ہوتا ہے۔جاوید انور کا تخلیقی وجدامن معروضی جبریت کے حصار کو توڑنے کی سعی لاحاصل ضرور کرتا ہے۔لیکن ناکامی اس کے ہاں شکستگی اور ناکامی کے جذبات پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ امید اور تبدیلی کی خواہش میں مسلسل مصروف رہتا ہے۔اس حوالے سے اس کی نظمیں "نیا تماشا"، "کھلے پانیوں کے نواح میں"، "تم کہو تو کہوں"، "مراجعت"، "حبس کا موسم ہے"، "ریچھ کیوں ناچتا ہے" اور "بوڑھا شرابی---ایک مکالمہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔"(۸)

جاوید انور کی زندگی کے مشاہدات اور آنکھوں دیکھے تجربات بھی ان کی شاعری میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کی ذاتی روداد محسوس ہوتے ہیں۔لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان زندگی کی دوڑ میں شامل ایک روبوٹ بن کر رہ گیا ہے۔وہ مشینی زندگی میں کھو کر فطرت سے رابطہ توڑ چکا ہے اور یہاں تک کہ رشتے نبھانے اور تعلقات جوڑنے کا سلیقہ بھی کھو بیٹھا ہے۔

جاوید انور نے معاش کی چکی میں پستے انسان کی بے بسی کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔یہ احساسات ہمیں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔وہ عام آدمی کے خوب صورت لمحوں کو بھی محرومی اور سماجی بے حسی میں ضائع ہوتے دیکھتے ہیں تو افسوس سے کہتے ہیں کہ

قسم ہے ڈوبتے دن کی
خسارہ ہی خسارہ ہے
ترے جوڑے کی کلیاں پاؤں کی مٹی
مرا کالر دھوئیں کا استعارہ ہے!

تنی گردن
کسا سینہ
کسی جھلسی ہوئی ٹہنی کی صورت گھر کو لوٹے ہیں
تو لگتا ہے
کہ ہم نے دن نہیں، جیسے ہمیں دن نے گزارا ہے

جاوید انور نے ایک عام آدمی خصوصاً ایک مزدور طبقے کے شخص پر ہونے والے استحصال پہ احتجاج کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس عام آدمی کو بھی اپنے حقوق مانگنے کی جرات پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس دنیا کا اصل اثاثہ عام آدمی ہے۔ عام آدمی بظاہر کسی گنتی میں نہیں آتا لیکن یہ کاروبارِ حیات، یہ ملیں، فیکٹریاں، کارخانے اور بڑی بڑی صنعتیں اسی عام آدمی کی محنت کے بل بوتے پر چل رہی ہیں۔ یہ اگر جرات پیدا کر کے ان سے ہاتھ اٹھالے تو سرمایہ دار کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہے گی۔ اپنے حقوق کی جنگ کا یہ سبق پڑھاتے ہوئے وہ عام آدمی کے دل میں امید کی ایک کرن جگاتے ہیں:

مہیب رات کے گنجان پانیوں سے نکل
نئی سحر کے ستارے تُو چمنیوں سے نکل
نکل کے دیکھ تری منتظر قطار، قطار
عزیز دانہ گندم تو بوریوں سے نکل

ستارے کا چمنی سے نکلنا، مزدور انقلاب کی علامت ہے، جو ترقی پسند ادیبوں کے نظریات کا خاصا ہے۔ جاوید انور گو کہ ایک متحرک سوشلسٹ نہیں تھے، تاہم ان کے نظریات ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی نظموں میں کہیں کہیں عام آدمی کا درد ایک مزدور اور کسان کے درد کی شکل میں نظر آتا ہے۔ عام آدمی کی سب سے بڑی مشکل روٹی ہے۔ شکم کی بھوک دور کرنے کے لیے چند نوالوں کا حصول دن بدن مشکل سے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ایک طرف امیر، امیر تر ہوتا جاتا ہے، دوسری طرف غریب کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اس محرومی کو ایک اور جگہ جاوید انور نے یوں شعر میں ڈھالا ہے:

وہ کوئی اور گھر تھے جن میں طیب رزق پہنچا
ہمیں تو بس قطاروں میں کھڑا رکھا گیا ہے

سماجی مسائل میں ایک بڑا مسئلہ تعصب اور عدم برداشت ہے۔ یہ تعصب مذہبی، مسلکی، لسانی، سیاسی اور قومی ہر سطح پر موجود ہے۔ ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کرنے اور اختلاف رائے برداشت کرنے کا حوصلہ دن بدن کم سے کم ہوا جاتا ہے۔ عقیدوں اور نظریات کا اختلاف لوگوں میں نفرت کی سیاہ دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ ایسے میں محبت اور سچی خوشی اپنے پنپنے کی کوئی جگہ نہیں پاتی۔ جاوید انور کی نظم "بس لحظہ بھر کو" اس لمحے اور پل کی تلاش ہے، جس میں انسان ان ساری نفرتوں اور تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف محبت کی خوشبو محسوس کر سکے۔ کہتے ہیں:

چلو تو ہم بھی لحظہ بھر کو
اپنے اپنے عرشوں کا سب بوجھ سروں سے گرد بھرے فرشوں پہ رکھ دیں
عقیدوں کے فولادی پھندے،
اور ہوس کے تیر کمان اِسی جنگاہ میں رکھ کے پھول چنیں
اک دوجے کی بانہوں کے رقبے میں
آنکھوں سے
اِک عکس بنیں،
عکس بنیں ان بنتی ٹوٹتی، ٹوٹتی بنتی دنیاؤں کی جگر جگر لشکارے مارتی لہروں میں
بس لحظہ بھر کو!

اس مشکل کام کو کرنے کے لیے شاعر جس ہمت کی تلاش کرتا ہے وہ اپاہج دنوں کی ندامت سے پیدا ہوئی ہے۔ انسان کی اپنے حالات کو بدل سکنے کی کوشش میں ناکامی اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اس کے اندر ایک مستقل روگ پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اس گھٹن سے آزاد ہونے کے لیے بہت سے حیلے کرتا ہے، ناکام ہوتا ہے اور پھر سے کرنے لگتا ہے۔

جاوید انور کی نظم "اپاہج دنوں کی ندامت سے ایک بند یوں ہے:

ضبط کی کھڑکیاں کھول دو
میں کھلوں جون کی دوپہر میں
دسمبر کی شب میں
سبھی موسموں کے کٹہرے میں اپنی نفی کا میں اثبات بن کر کِھلوں
خواہشوں، نیند کی جنگلی جھاڑیوں
اپنے ہی خون کی دلدلوں میں کھلوں
بھائیوں کی پھٹی آستینوں میں
بہنوں کے سجدوں میں
ماں باپ کے بے زباں درد میں ادھ جلے سگرٹوں کا تماشا بنوں
میں اپاہج دنوں کی ندامت بنوں
کھڑکیاں کھول دو
جاگنے دو مجھے

سماجی مسائل میں ایک اور بڑا مسئلہ مذہبی منافرت اور اجارہ داری ہے۔ مذہب اگرچہ انسان کی آسانی اور سکون کے لیے آیا تھا لیکن مذہب کے ٹھیکیداروں نے عام آدمی کو اس سے بے زار اور دور کر دیا۔ معاشرے میں پنپتے فرقوں اور تعصبات نے جن کرداروں کے ذریعے جنم لیا، وہ بظاہر مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوتے ہیں، لیکن خدا کے بندوں کو خدا سے دور

کر دیتے ہیں۔ ہمارے سماج کا یہ بڑا المیہ ہے کہ خدا کے نائب خود خدا بن بیٹھتے ہیں۔ جنت دوزخ کے ٹکٹ بانٹتے اور کافر ،مومن کی مہریں لگاتے جاتے ہیں۔ مذہب انسانوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گیا ہے جسے وہ دوسروں کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو بظاہر بڑے بڑے مسائل حل کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن اصل میں اپنے گھر اور اہلِ خانہ کے مسائل سے بھی غافل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مولویانہ کردار "ابو عبیدہ کو جاوید انور نے نظم میں بیان کیا ہے:

ابو عبیدہ
عبائے ریشم بدن کی زینت
عمامہِ زر نگار سر پر
ابو عبیدہ ہیں جو کہ رخشِ ہوا پہ چابک چلا رہے ہیں
کہ سیر جنت کو جا رہے ہیں
ابو عبیدہ"
"ابو عبیدہ ذرا ٹھہرنا"
پسِ دریچہ برہنہ پا و بدن دریدہ کھڑی ہے بنتِ ابو عبیدہ
نہ گھر میں گندم، نہ خشک انجیر اور نہ خرما
گدا وگر ما گلی میں دوزخ منا رہے ہیں
فرشتے چابک چلا رہے ہیں
کہ سیر جنت کو جا رہے ہیں ابو عبیدہ
ابو عبیدہ کو سب روا ہے
ابو عبیدہ کا فیصلہ ہے

مندرجہ بالا نظم پر طارق ہاشمی نے اپنی کتاب جدید نظم کی تیسری جہت میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

> ”فکر کو قید کرنے والے مذہبی پیشوا خود ذہنی طور پر کتنے پسماندہ اور سماجی مسائل سے کس حد تک نابلد ہیں، اس کا اظہار جاوید انور کے کردار ابو عبیدہ سے بخوبی ہوتا ہے جس کے نزدیک مذہب چند رسوم سے آگے کچھ نہیں ہے۔ یہ کردار ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو چند نیکیوں کے حصول اور چند برائیوں سے گریز کو حصولِ جنت کا وسیلہ سمجھ کر کچھ عبادات میں مشغول رہتا ہے مگر درونِ سماج حتٰی کہ درونِ خانہ بھی بعض مسائل کا ادراک نہیں رکھتا۔“(۹)

انسان اگر حساس اور دردِ دل رکھنے والا ہو تو سماجی ناانصافی اور معاشرے کے مسائل سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ سماج کا درد اس کا درد بن جاتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد ہونے والے ہر ظلم، جبر اور استحصال کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس کی

نشان دہی کرنے میں بھی نڈر ہوتا ہے۔وہ بے حس بن کر، خاموش تماشائی بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔اپنی اس کیفیت کو جاوید انور نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عجب خوابوں سے میرا رابطہ رکھا گیا ہے
مجھے سوئے ہوؤں میں جاگتا رکھا گیا ہے

اس سوئے ہوئے معاشرے میں ایک جاگتا انسان جس کرب میں مبتلا ہوتا ہے،وہ کرب ہمیں جاوید انور کے ہاں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ایک شاعر کا حساس دل شعوراور آگہی کے دکھ میں ہمیشہ جلتا کڑھتا رہتا ہے۔جاوید انور کے ہاں سماجی بہتری کی ناکام خواہش تلخی اور غصے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔وہ اس بات پر افسردہ نظر آتے ہیں کہ یہاں ہر سعی، سعی ناکام کیوں بن جاتی ہے اور ہر تعمیر کی خواہش توڑ پھوڑ اور شکستگی کو کیوں جنم دیتی ہے۔سماجی حالات ذات کی شکست وریخت کو جنم دیتے ہیں اور انسان اپنی شناخت کی تلاش کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جاوید انور کی نظموں میں شہر اور شام کا بہت ذکر ملتا ہے۔ان کی ایک کتاب کا نام بھی "شہر میں شام" ہے ان کی بہت سی نظموں کا ماحول شہری زندگی کے لوازمات اور ان کے تجزیے سے تشکیل پاتا ہے۔ڈاکٹر امجد طفیل نے اپنی کتاب ہم عصر اردو شاعری میں جاوید انور کی نظموں کے اس پہلو پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"شہر جو کبھی روشن فکری، انسانی حوصلہ مندی اور ترقی کی علامت ہوا کرتے تھے لیکن یہ شہر جو جاوید انور کی نظموں میں آباد ہے، زنداں سے بس تھوڑا ہی مختلف ہے۔یہ شہر اپنی فصیلوں کے اندر اماں کم رکھتا ہے اور اذیت زیادہ۔"(۱۰)

ٹیکنالوجی کی دوڑ اور صنعتی ترقی نے شہروں کا طرزِ زندگی بہت تبدیل کر دیا ہے۔کارخانوں، فیکٹریوں، ملوں اور سڑکوں کے ہجوم، شور اور آلودگی نے انسان کو ذہنی طور پر تھکا کر رکھ دیا ہے۔ایسے ماحول میں شہر میں رہنے والوں کی زندگی کی مثال انھوں نے شام سے دی ہے۔"شہر میں شام" دراصل تنہائی کا استعارہ ہے۔نئے دور کے آدمی نے گلوبل ویلج میں اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔اب اسے اکیلا پن تو میسر ہے لیکن وہ تنہائی نہیں جس میں وہ خود کو پہچان سکے اور اپنے آپ سے مل سکے۔شہر کی بھیڑ دن بھر انسان کو مصروف رکھتی ہے لیکن شام ہوتے ہی تاریک سائے اسے احساس دلاتے ہیں کہ وہ اس ہجوم میں اکیلا ہے اور خود سے بچھڑ چکا ہے۔

ان کی ایک نظم "مجھے شام آئی ہے شہر میں" سے ایک بند ملاحظہ ہو!

میں سفر میں ہوں
مرے جسم پر
ہیں ہزار رنگوں کی یورشیں
کہیں سرخ پھول کھلا ہوا
کہیں نیل ہے
کہیں سبز رنگ ہے زہر کا

مگر آئینہ شبِ شہر کا
مری ڈھال ہے!

شہر کے اس گھٹن زدہ ماحول کا تذکرہ جاوید انور نے اپنی ایک اور نظم میں بھی کیا ہے۔ کسی سماج کا ماحول فرد کی بے بسی اور بے حسی کو ذاتی سطح سے اٹھا کر سماجی دائرے تک پھیلا دیتا ہے۔ نظم "کس حبس کا موسم ہے" سے ایک بند اس کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے:

کس حشر کا موسم ہے
اک آس پہ زندہ ہیں
سانسیں بھی نہیں لیتے
پتھر بھی نہیں بنتے
کس خواب کی خواہش ہے
اُٹھتے ہیں نہ سوتے ہیں
کس درد کی لذت ہے
ہنستے ہیں نہ روتے ہیں
کس حشر کا سکتہ ہے

شہر کا یہ منظر جاوید انور کی ایک اور نظم "چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی" میں بھی ملتا ہے۔ خود کلامی (مونولاگ) کی شکل کی یہ نظم انسان کی اس داخلی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے جو اس گلوبل ویلج میں زندگی گزارنے والے انسان کو درپیش ہے۔ اس نظم میں شاعر نے بظاہر اپنی زندگی کے چھبیس سالوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ آنے والی کمائی اور کھو جانے والے سرمایے کا حساب کتاب کیا ہے، تاہم یہ جائزہ ایک فرد کی زندگی کا نہیں بلکہ اس سماج کا ہے جس میں شاعر خود یہ چھبیس سال گزارتا ہے۔ وہ تلاشِ رزق میں دربدر بھٹکتا ہے۔ اپنے خواب آنکھوں میں سجائے کاسہ لیے تعبیر کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اپنی محرومیوں کو چھپا کر رکھنے کی کوشش میں مزید عیاں ہوا جاتا ہے۔ یہ چھبیس سال زندگی کے دیے گئے سوالات حل کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہیں۔ نظم کا ایک بند درج ذیل ہے:

یہاں اپنے ارادے ٹائی کی بندش میں لے کر چلنا پڑتا ہے
کہ ان سڑکوں پہ دورویہ سجے شوکیس آنکھیں چھین لیتے ہیں
مرے سب خواب میرے کوٹ کے اندر کی جیبوں میں پڑے ہیں
یہاں سب اپنے اک اک ہاتھ میں ڈگری لیے
دوجے میں اُلٹا ہیٹ پکڑے
زندگی کے تار پر کرتب دکھاتے ہیں!
مگر ایسا یہاں کوئی نہیں جو ہیٹ میں سکہ ہی لڑھکا دے

فکرِ معاش کی تصویری جھلک جاوید انور کی کئی نظموں میں ملتی ہے۔ عام آدمی کی حسرتیں اور محرومیاں انھیں بہت بے چین رکھتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی ایک عام آدمی تھے۔ شہر کی ایک اور تصویر اسی نظم میں آگے چل کر جاوید انور نے کچھ یوں کھینچی ہے:

دن کا آغاز۔ اخبار، باسی حروفِ تہجی
سیہ فام آزادیوں کی حکایات میں گورے کردار
آبادیوں سے پرے گندگی ڈھیر پر باکرہ ماؤں کے
مرثیے، باپ کا خون بیٹے کے ہاتھوں،
وہی گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا
وہی پانی پہلے پلانے پہ جھگڑا،
وہی شام تک شہر کی سب بڑی چھوٹی سڑکوں
کے چکر، دفاتر کا بے فیض سا اک طواف اور
حکومت کی مہریں لگے کاغذوں کو سلام
اور خوابوں کا کہرام
اور شام!

دورِ جدید کے سماجی مسائل میں تنہائی ایک بڑا المیہ ہے۔ جدید حسیت آج کی زندگی کا احساس ہے۔ آج کا انسان معاشرتی طور پر تنہائی کا شکار ہے۔ اس کی زندگی میں بے مقصدیت، لایعنیت اور پیچیدگی اور الجھاؤ ہے۔ دنیا بظاہر گلوبل ویلج بن گئی ہے لیکن انسانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مادیت پرستی نے انسانی جذبات و احساسات اور اخلاقی اقدار پر غلبہ پالیا ہے۔ زندگی سے بےزاری، اکتاہٹ اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کے رجحان نے معاشرے کو جمود کا شکار کر دیا ہے۔ یہ ایک منفی رجحان ہے۔ معاشی و سماجی عدم مساوات، سیاسی دباؤ سے پیدا ہونے والا سماجی اضطراب اور استحصال انسان کے روز و شب کو ایک مستقل بے چینی میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ انسان اپنے وجود کو سمیٹنے کی کوشش میں مزید بکھرتا چلا جاتا ہے۔ انتشار اس کی ذات کا حصہ بن گیا ہے۔

بہت سے شعرا نے تنہائی کی مختلف کیفیتوں کو اپنے اپنے انداز میں شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ بڑے شہروں کی تنہائی میں آدمی اپنے آپ سے بھی بچھڑ جاتا ہے۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتے، فکرِ معاش میں الجھے وجود اور گردشِ حالات کا شکار لوگ، شہروں کی داستانِ حال اپنی زباں آپ کہتے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" میں لکھا ہے:

"اگر گوتم نروان حاصل کرنے کے لیے جنگل کی بجائے کسی بڑے شہر کا رُخ کرتا تو باآسانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا کیونکہ بڑا شہر بھی انسان کو وہی احساسِ تنہائی بخشتا ہے جو ایک خاموش جنگل" (١١)

مشینی دور کا انسان فطرت سے کنارہ کش ہو کر صرف مشینی بھاگ دوڑ میں مبتلا ہے۔ وہ زندگی کے اصل ذائقے کو

محسوس کرنا بھول گیا ہے۔ مغربی تہذیب کے زیرِ اثر خاندانی نظام تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور آدمی رشتوں، تعلقات سے بے پرواہ ہو کر روبوٹ بن کر رہ گیا ہے۔ انسان کی خوشی اور سکون کے لیے جو ماحول چاہیے وہ بہت سادہ اور فطری ہے۔ اس کے ارد گرد کے قدرتی نظارے، رشتے اور احساس و محبت سے جڑے تعلقات اس کے ذہنی سکون اور صحت کے لیے سب سے مؤثر ذریعہ ہیں۔

تنہائی کے وسیع صحرا میں بھٹکتے ہوئے انسان سب سے زیادہ جس چیز سے قربت محسوس کرتا ہے، وہ اس کا گھر اور خاندان ہے۔ خاندان سماج کی اکائی ہے۔ گھر، خاندان، رشتے اور تعلقات سماج کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کی سیرت و کردار اور شخصیت کی تعمیر میں اس کے گھر اور اہلِ خانہ کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ کسی بھی اختلاف اور جھگڑے سے ختم نہیں ہوتا۔ دھندلا جائے تو محبت بھرے ایک بول سے یہ دھند چھٹ جاتی ہے۔ جاوید انور کی نظموں میں آپ کو کئی جگہ گھر اور گھر والوں کی محبت اور یاد جھلکتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ملک سے باہر آسٹریا میں گزارا لیکن اس ہجرت نے گھر اور گھر والوں سے ان کا تعلق کمزور نہیں پڑنے دیا۔ وہ اپنی جڑوں سے جڑے رہنے پر یقین رکھتے تھے اور یہ یقین ہمیں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ انھیں اعتماد ہے کہ وہ جب بھی سفر سے واپس لوٹیں گے، ان کا آنگن باہیں کھولے ان کا منتظر ہو گا۔ تبھی تو کہتے ہیں:

یہ جو مٹی بالوں میں اور گالوں پر ہے
سونا بن جائے گی، جب گھر جاؤ گے تم

اسی طرح ان کی ایک خوب صورت اور سادہ سی نظم "مراجعت" ہے جس میں وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائی اور خونی رشتوں کی محبت اور خلوص کو یاد کرتے ہیں۔ گھر اور گھر والوں کے ساتھ گزرے وقت کا ناسٹلجیا انھیں پھر سے ان بظاہر عام سے دنوں، عام سی شاموں میں واپس جانے پر اکساتا ہے۔ گھر کا ایک سادہ اور خوب صورت منظر دیکھنے کے لیے نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

عام سی شام ہو
لیکن اس شام کے راستے میرے گھر جا رکیں
گھر کی دہلیز پر
میری ماں
مسکراتے ہوئے میرے گریاں دنوں کی تھکن چوم لے
شام کی سرحدوں سے مؤذن پکارے
تو سب بھائی بہنوں کی چپ میں مری چپ بھی ہو
شام کی سیج پر باپ کے جسم سے میرے بازو اگیں
جب منڈیروں پہ رکھے دیے جگمگانے لگیں
ٹوٹتے فرش پر میرا بھی عکس ہو

میرا بھی نام ہو
عام سی شام ہو
شام سی شام ہو!

گھر بنانے کی یہ چاہ انسان کے اندر فطری ہے۔وہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی پھر لے،اسے واپس گھر لوٹنے کی خواہش ہمیشہ رہتی ہے۔گھر کا احساس، چاردیواری اور تحفظ کی علامت ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت جب ایک دوسرے سے جڑتے ہیں تو ایک نئے آشیانے کی تعمیر ان کی اس جڑت کا اولین مقصد ہوتا ہے۔جاوید انور نے اس احساس کو یوں زبان دی ہے:

تم دیوار بنو اور ہم در بن جائیں
آؤ دونوں مل کے اک گھر بن جائیں

ہر عہد کا ادب اس عہد کے سماجی حالات اور ان کے اثرات کو اظہار میں لاتا ہے۔ادب کا سماج سے تعلق ایسا گہرا ہے کہ ادب خصوصاً شاعری کی کسی بھی صنف کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سماج سے کنارا کر کے کوئی الگ دنیا تخلیق کر سکے۔ہر صنفِ ادب اور ہر صنفِ شعر سماج کی نیو پر کھڑی ہے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ سماجی حالات و واقعات سے جڑی ہوئی ہے۔تاہم ادب کا سماج سے تعلق ایک ناقد کا تعلق ہے۔ادیب و شاعر جن مثالی بنیادوں اور اصولوں پر ایک سماج کو پرکھتا ہے، حقیقت میں کوئی سماج ان پر مکمل طور پہ پورا نہیں اترتا۔یہ ناآسودگی دنیا کی ہر قوم اور ہر معاشرے میں نظر آتی ہے تاہم بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کی بہتات ہے۔ہمارے مشرقی معاشرے میں جو اخلاقی اقدار اور روایات زندگی کو مثبت ڈگر پر لے کر چلنے کے لیے بنائی گئی تھیں، وہ خود اہلِ مشرق کے ہاتھوں ہی پامال ہیں اور سماج کو روبہ زوال کر رہی ہیں۔

> ”ادبی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ کسی بھی دور کا آدمی اور کوئی بھی فلسفہ اپنے دور کے سماج سے ہم آہنگی کا رشتہ قائم نہیں کر سکا۔کہیں نہ کہیں اس ناآہنگی کے اسباب اس عہد کی سنگدلانہ سیاست یا پاور کے جبر میں ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔یہ سماج ایک ایسا دوغلا سماج ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔قانون سازی، انتظامیہ اور میڈیا کی کلید جن ہاتھوں میں ہے وہ سماج کے مختلف طبقوں کو بڑے اعتماد اور تیقن کے ساتھ اپنے نظریے کے مطابق ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہیں۔جسے جھٹلانے، نشان زد کرنے یا سوال زد کرنے کا یارا صرف اور صرف ادب میں ہوتا ہے۔“(۱۲)

ایک سچے ادیب میں جو خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری موجود ہوتی ہے وہ اسے ہر موقع، ہر طرح کے حالات میں سوال اُٹھانے کی جرات بخشتی ہے۔وہ دادو تحسین کے ڈونگروں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سچ کا علم لے کر اس شاہراہ پر چلتا ہے جہاں اسے حاکمِ وقت کے دیے تمغے اور انعام واکرام بھی اعزاز نہیں لگتا۔بلکہ ایک ایسا بوجھ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ کھل کر بات کرنے میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے، اس لیے وہ ان تمغوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔

جنہیں عزیز تھی اپنے لہو کی حرمت وہ

ترے دیے ہوئے تمغے اتار آئے ہیں

جاوید انور کی نظم "بھونک" سے ایک بند:

شور ہے،
آہیں، کراہیں، گالیاں، نعرے، خموشی
شور ہے
خامشی کا شور ہے
خامشی ہے فیکٹری میں گریس بنتے باپ کی
کیتلی میں آنسوؤں کا شور باھے، ماں کی آنکھوں میں سلگتی
ریت پر بچوں کے سایے سورجوں کی جیکٹیں پہنے ہوئے
رقصاں ہیں
بھونک!
جانِ ناپرسان بھونک
بھونک اس شہر ستم کی بے وفا گلیوں میں جس کے مدرسوں
میں کھڑکیاں ہیں اور نہ روشن دان ہیں
مسجدیں شامِ غریباں، روشنی غارِ حرا میں قید ہے
بوجہل اور بولہب کی چھاتیوں پر تمغہ جرات سجے ہیں
بھونک اے خارش زدہ حیوان بھونک!
بھونک ان کے واسطے جو بھونک بھی سکتے نہیں!

اپنی بے بسی کے اظہار کے لیے شاعر نے کہیں کہیں بہت بلند آہنگ اور تلخ لہجے میں بھی بات کی ہے۔ اپنی نظم "سوتا جاگتا خواب میں لکھتے ہیں:

ہم سب، ہم جو بے ہتھیار ہیں،
جن کی گندم، جن کا پانی
جن کا تیل اور جن کا سونا،
جن کا خون پسینہ تیرے
خس خانوں میں گرتا ہے تو،
تجھ کو ٹھنڈک ملتی ہے،
تجھے ماریں!

ڈاکٹر شمیم حنفی سن ساٹھ کے شعرا کے شعری رجحانات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سائنس، ٹیکنالوجی، کاروباری مقاصد و رسافیت کے فروغ نے جن قدروں کی پرورش

کی تھی اور جس طرح کے معاشرے کو جنم دیا تھا، اس میں سانس لینے والے یہ تمام شاعر تقریباً ایک سی اخلاقی سراسیمگی کا شکار تھے۔ ایک سی تشویش میں مبتلا تھے۔ ایک دردِ مشترک کے سوا ان کے پاس کوئی اور مشترکہ میراث نہ تھی۔"(۱۳)

سماجی حالات کی پیدا کردہ بے بسی نے انسان کے مجموعی رویے میں ایک مایوسی اور آزردگی پیدا کر دی ہے۔ وہ زندگی کے منفی مسائل کے بادل تلے کھڑا مثبت پہلوؤں کو نہیں دیکھ پاتا۔ منفی سوچ انسان کے اندر سے جینے کی امنگ ختم کر دیتی ہے اور اس سماج کو ایک تاریک اور بدبودار ماحول میں تبدیل کر دیتی ہے۔ لوگ چلتی پھرتی لاشوں کی طرح ہر کام بے دلی اور پژمردگی سے کر رہے ہوتے ہیں۔ جاوید انور نے اس بات کا اظہار اپنی ایک نظم "اُسے آزردگی لاحق ہے" میں کیا ہے۔ یہ نظم ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو تلاشِ رزق میں پردیس کا سفر کرتا ہے، زندگی بھر کی محنت کے بعد آخری عمر میں اب وہ اپنی بیماری سے اکیلا لڑ رہا ہے۔ اس کی تنہائی نے دل و دماغ کو ایک مسلسل کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کے اندر ایک مستقل جنگ چل رہی ہے۔ اس مایوسی کے عالم کبھی کبھی وہ زندگی کو ختم کرنے کا سوچنے لگتا ہے، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اس کے اندر جو کشاکش ہے، وہ اسے وقت سے پہلے مار دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک انسان کی یہ آزردگی اور افسردگی شاعر کے لیے دکھ کا باعث ہے اور وہ سوچتا ہے کہ یہ فرد زندگی کے مثبت رنگوں کو کیوں نہیں دیکھتا، ان کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہو رہا۔ شاعر دراصل اس میں ایک امید جگانا چاہتا ہے۔

بھنور شریان میں ہوں تو پلوں سے کودنے کی کیا ضرورت ہے
مگر وہ سوچتا رہتا ہے لیکن سوچتا کم ہے
کہ اس کو اپنی نامردی پہ ملک الموت سے بڑھ کر یقیں ہے،
کانپتا رہتا ہے دن بھر
رات بھر نیندوں کی پہرے داری کرتا ہے
نہ اس کو خواب آتے ہیں نہ اس کی آنکھ کو سورج،
ستارے، پھول اور تتلی سے کوئی واسطہ ہے،
جانتا ہے وہ اسے آزردگی لاحق ہے،
ہنسنا چاہتا ہے، سوچتا ہے کیوں ہنسوں،
میں ہنس پڑا تو زندگی ہنسنے لگے گی!

زندگی کو برتنے کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے جاوید انور نے اپنی ایک اور نظم "گوندا کی کہانی" میں اپنے رویے کا تقابل ایک پھٹے پرانے کرتے والے درویش سے کیا ہے جو زندگی کے ہر غم کو بھول جانے کا ہنر جانتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں ہنسنا نہیں بھولتا۔

نظم کی چند سطریں ملاحظہ ہوں!

پھٹا کرتا تھا، سر میں دھول تھی، ہاتھوں میں چھالے،

پاؤں میں جوتے نہیں تھے
مگر وہ بات کرنا اور ہنسنا جانتا تھا
ہنسا اور ہنس کے بولا
"بھلا دینے میں دکھ ہے"

درویش کی اس حالت کا موازنہ شاعر نے خود سے کیا ہے جب اس بات کو گزرے زمانہ ہو چکا تھا اور زندگی کے کئی رنگ دیکھنے کے بعد اسے ایک دن اس کی کہی بات یاد آئی اور اس نے اپنے حالات کا جائزہ لیا تو خود کو جس حال میں پایا، اسے یوں نظم کا حصہ بنایا:

میں اُس کو بھول بیٹھا
میں سب کچھ بھول بیٹھا
زمانے ہو گئے ہیں
پھٹا کرتا ہے، سر میں دھول ہے، ہاتھوں میں چھالے،
پاؤں میں جوتے نہیں ہیں
ہنسی اندر ہی اندر گونجتی ہے
لبوں کو چومتی ہے بات لیکن لب نہیں ملتے!

شاعری کے حوالے سے معین تابش "شہر آشوب میں لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک شاعری ایک واردات ہے اور تجربہ بھی، چنانچہ شاعر کو اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر کچھ اس طور پر اپنا عرفان حاصل کرنا چاہیے کہ ساتھ ہی اس کے عصر کا چہرہ بھی روشن ہونے لگے۔"

شاعر کا آئیڈیل معاشرہ اس کے معیارات کو بلند کر دیتا ہے۔ سماج کی بے مقصدیت اور بے سمتی شاعر کے دل میں افسوس اور شکوہ پیدا کرتی ہے۔ جاوید انور کے موضوعات اور مضامین میں تنوع ہے اور وسعت بھی۔ لہجہ کہیں تلخ اور کٹیلا ہے، کہیں طنز سے بھرپور۔ کہیں کہیں سادہ بات کے پردے میں کڑواہٹ کا اظہار ہے۔ اپنی ذات پہ گزری واردات کو کائنات کے اجتماعی دکھ میں مدغم کرنا اور اجتماعی دکھوں کو اپنی ذات پر محسوس کرنا ایک بڑے شاعر کا خاصہ ہوتا ہے۔

نظم "سورجوں کا سفر" سے ایک منظر:

کتنے دیوار و در ہیں جن سے پرے
برتنوں کو ترس گئے چولہے
آنگنوں سے دھواں نہیں اُٹھا
کس نے لکھا دعائے اول میں
گریۂ طفل، صبح نو کے نام
بندگی قرض ہو گئی جیسے!

نانِ شب کی جہد میں ایک ہجوم
دفتروں اور ملوں کی سمت گیا
زندگی فرض ہو گئی جیسے!

صبح سے شام کی طرف یونہی
سوئیاں کھینچتی رہیں ہم کو!
منزلوں کی تلاش میں ہم لوگ
حاصلِ عمر، بے ثمر اسناد
دستِ شاہاں کے دستخط لے کر
شاہراہوں سے خواب چنتے ہیں
مدرسوں میں شباب جلتا ہے
خواہشیں دفتروں میں پلتی ہیں
خون جلتا ہے کارخانوں میں

دولتِ شوق چھین لی کس نے
جو گھروں سے ضیائیں لائے تھے
چند نابینا حرف اٹھائے ہوئے
مدرسوں سے وہ کور چشم چلے
خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے
دفتروں اور کارخانوں سے
وعدہ و خوابِ فردا ساتھ لیے
سب گھروں کی طرف روانہ ہوئے

جاوید انور نے ایک حساس انسان ہونے کے ناطے سماجی مسائل و مشکلات پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہیں ان سب حالات کے ہوتے ہوئے ایک امید کا پیغام بھی دیا ہے۔ وہ امید جس پر کوئی معاشرہ زندہ رہتا ہے۔ وہ منفی چیزوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں لیکن مثبت پہلوؤں سے آنکھ بند نہیں کر لیتے۔ تبھی تو اپنی نظم گونج کو انت نہیں میں لکھتے ہیں:

باغ میں پھول بھی ہیں
باغ میں دھوپ نہیں
آنکھ میں دھول بھی ہے

آنکھ میں پھول بھی تھے

نظم ''سلطان علی''، جاوید انور کی ایک ایسی شان دار نظم ہے جو آدمی کو اپنی جڑوں کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیتی ہے، لیکن جب وہ پھر سے اُن پرانے خواب دنوں کی تلاش میں نکلتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دن اب وقعی خواب ہو چکے ہیں اور وہ شناسا گلی کوچے بھی نامہرباں دکھائی دیتے ہیں۔ وقت سمندر کا دھارا ہے، جو تیزی سے اپنے ساتھ روز وشب اور زمان و مکاں کے خال و خد بہالے جاتا ہے۔ آدمی ایک مدت بعد اپنے شہر لوٹے تو شہر اسے اور وہ شہر کو حیران نظروں سے دیکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فاصلہ دیو ہے، جو سارے تعلقات اور رشتے نگل جاتا ہے۔ نظم بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں سلطان علی جب امریکہ سے واپس پلٹتا ہے اور لاہور میں جا کر اپنے گزشتہ دنوں اور یادوں کی تلاش شروع کرتا ہے تو اسے لاہور بیک وقت مانوس اور اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ سلطان علی کو جاننے والے سبھی رخصت ہو گئے یا گردشِ حالات میں ارد گرد بکھر گئے۔ اب وہ گلیاں وہ یارانے خواب ہوئے جنھیں پھر سے زندہ کرنے کے لیے سلطان علی لاہور آیا تھا۔ رزق کی تلاش میں گھر سے نکلنے والوں کو اپنی ذات کی نفی کر کے جس دوڑ میں لگنا پڑتا ہے، وہ ان سے ان کی شناخت تک چھین لیتی ہے۔ نظم کا کردار سلطان علی پنڈ دان خان کا رہنے والا ہے، جو پہلے اپنے گاؤں سے بڑے شہر کی طرف رخ کرتا ہے اور پھر امریکہ کا ویزہ حاصل کر لیتا ہے۔ معاشی لحاظ سے اس کی حیثیت اس سفر میں مضبوط ہو جاتی ہے لیکن اس کی اپنی شناخت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

سلطان علی ایک کردار ہے جو میں بھی ہوں اور آپ بھی، ہم سب ہی ہیں۔ شاعر نے اس کردار کے ذریعے ہر آدمی کے ناسٹلجیا کو زندہ کر دیا ہے۔ نظم کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

لاہور چلو، لاہور چلو
لاہور میں ہے وہ چورن جو
ہر وحشت کو کھا جاتا ہے
سلطان علی
سرسبز دنوں کی ویرانی
کا روگ لئے
لاہور گئے
لاہور کی بات نرالی تھی
گدلائی ہوئی تھی دھوپ وہاں
کملائی ہوئی ہریالی تھی
سڑکوں پہ بلا کی رونق اور
سینے میں بلا کا سناٹا
سلطان علی کے سپنوں میں

اب ویزا تھا امریکا کا
واشنگٹن کے مے خانوں میں
سلطان علی کے کانوں میں
پنڈ دادن خان کے مچھر اب
دن رات گٹار بجاتے ہیں
پنڈ دادن خان کی گلیوں میں
سلطان علی
کو جاننے والا کوئی نہیں

جاوید انور کی نظم " قابیل کا دکھ ایک منفرد انسانی احساس کی تصویر ہے جس میں ایک مجرم کی نفسیات اور اس کے جرم کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض اوقات انسان ایک طویل عرصہ ظلم سہنے کے بعد اتنا بے حس ہو جاتا ہے کہ وہ بدلے کے لیے یا اپنے ذہنی سکون کے لیے کسی بھی حد کو پار کر جاتا ہے۔ نظم میں ایک بیوہ کی کہانی بیان کی گئی ہے جو بیک وقت ایک مظلوم مجرم ہے۔ جس کی زندگی کی اصل کہانی معلوم نہیں ہو پاتی لیکن اس کے حالات کی ایک ادھوری سی تصویر نظم کے بہت سے مصرعوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نظم کا دوسرا بند کچھ یوں ہے:

کس خواہش کی دھوپ دلوں میں کالک بھر دیتی ہے
کس جنت کی سوچ دنوں کو دوزخ کر دیتی ہے
بھید نہیں کھل پاتا!
"خوش ہوں" وہ کہتی تھی
"بچے، گھر، فرنیچر،
اچھے کپڑے، مہنگا زیور
اور محبت کرنے والا شوہر
اتنا کچھ ہے بابل کا گھر بھول گئی ہوں۔"
"بیٹا پھر لقموں کے بیچ یہ لمبے لمبے وقفے کیوں ہیں؟
تکیہ کیوں گیلا ہے؟
سارا سارا دن تم دھوئے ہوئے برتن کیوں دھوتی رہتی ہو؟"
"پتا نہیں ماں۔۔۔!"
پتا نہیں می لارڈ کسی کو پتا نہیں کیوں؟؟

نظم کے مندرجہ بالا بند سے جو تصویر بنتی ہے، وہ ایک ایسی شادی شدہ لڑکی کی زندگی کی کہانی ہے، جو بظاہر خوش ہے، اس کے پاس دنیا کے معیار کے مطابق وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ایک شادی شدہ زندگی کے اچھے ہونے کے لیے

ضروری ہیں۔ لیکن اس کے رویے اور عادات میں اس کی ماں ایک ادھوراپن ڈھونڈ لیتی ہے جس سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بیٹی کسی پریشانی یا الجھن میں ہے۔ لیکن اس کی ذہنی کیفیت کا اسے خود بھی ٹھیک سے علم نہیں۔ نظم کا اگلا بند اس منظر کو بیان کرتا ہے جس میں وہ عورت اپنے شوہر کو مار دیتی ہے۔ اس کے ہاتھ خون سے تر ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں وہی بھولی اور معصوم چڑیا ہے جو کسی کو دکھ دینے کے قابل نہیں لگتی۔ اسے خود بھی علم نہیں یا شاید اس کیفیت کا ادراک تو ہے اعتراف نہیں، جس میں وہ یہ انتہائی قدم اٹھا لیتی ہے۔ نظم کے آخر میں ایک مجرم کی نفسیات کے اس پہلو پر سوال اٹھایا گیا ہے جو ان الفاظ میں ہے:

بول یہاں قابیل کے دکھ کا کسے پتا ہے؟
کیا اس بہتے خون میں اس کی خوشی چھپی تھی؟
کیا اس بکھری زلف کے سائے دوزخ ٹھنڈی کر سکتے تھے؟

"ریشم جیسی گود کی خواہش" ایک ایسی نظم ہے جو جاوید انور نے اپنے مرحوم بھائی شہزاد انور کے لیے لکھی تھی جو بہت کم عمر میں شہ رگ پھٹنے سے انتقال کر گئے تھے۔ یہ نظم بیک وقت سماجی بے حسی، معاشرتی حالات اور انسانی زندگی کے کئی المیوں کو بیان کرتی نظر آتی ہے۔ نظم میں شاعر نے اپنے باپ اور بھائی کی زندگی کی مختلف محرومیوں کو بڑی جان دار سطروں میں سمو کر زندہ کر دیا ہے۔ یہ، محرومیاں ایک عام آدمی کی محرومیاں ہیں۔ مثلاً ایک منظر کی چھوٹی سی تصویر دیکھیے!

اور ہم کھیل رہے تھے، خوش تھے
ابو آئیں گے
لڈو لے کر آئیں گے
تُو آیا تو تیرا چہرہ زرد تھا، تیری آنکھ میں آنسو تھے،
تیری مہینے بھر کی کمائی جیب تراش کی جیب میں تھی!

ایک شخص جو اپنی آنکھوں میں خواب سجائے، بچوں کا رزق کمانے گھر سے نکلا ہوتا ہے، اس کی مہینے بھر کی کمائی کوئی جیب کترا لے جاتا ہے۔ اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے چھوٹی چھوٹی خواہشات رکھنے والا انسان جب ایک لمبے انتظار کے بعد ان کی تکمیل کی راہ دیکھ رہا ہوتا ہے، اسی وقت ایک چار اچکا اس کی جیب سے وہ چند نوٹ لے اُڑتا ہے جن سے وہ بچوں کی ننھی خوشیاں خرید سکتا تھا۔ ان حالات میں بچے بھی وقت سے پہلے بڑے ہو جاتے ہیں اور انھیں اپنی حیثیت کے مطابق خواب دیکھنے کا ڈھنگ آ جاتا ہے۔ اسی محروم بچپن کی ایک اور چھوٹی سی تصویر شاعر نے یوں کھینچی ہے:

رُکے ہوئے آنسو اور سکول کا رستہ۔۔۔ بھنیں
باپ کا کھیسہ خالی تھا سو
تیرے بستے میں بھی کتابیں کم تھیں خواب زیادہ تھے۔

اسی طرح سماج کے ایک اور پہلو کی تصویر بھی موجود ہے جس میں جائز کام کا کوئی رستہ نہیں اور ناجائز کام ایسی جگہوں پر ہو رہے ہیں جن کا تقدس انسان کو حیران ہو کر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور رشوت لیتے

ہیں، روزہ رکھ کر بے ایمانی کرتے ہیں، حرام کما کر گھر بناتے ہیں اور پیشانی پر "ھذا من فضل ربی" لکھوا لیتے ہیں، زکوٰت کھا جاتے ہیں اور یتیم خانوں میں چاولوں کی دیگیں پکوا کر بانٹتے ہیں۔ مسجدیں جو جائے امان سمجھی جاتی ہیں وہاں بھی دھندہ کرنے والوں نے ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ انسانی رویوں کا یہ تضاد ایک سیدھے سادے اور ایمان دار بندے کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں۔ وہ جس مثالی معاشرے کو تلاش کر رہا ہے، اسے اپنے ارد گرد بالکل برعکس ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔

تُو مسجد کو جائے امان سمجھتا تھا
لوگ وہاں جعلی اسناد پہ مہریں لگوانے جاتے تھے

نظم کے آخر میں جاوید انور نے اپنے بھائی کی وفات پر معاشرے کے اس منافق رویے کا نوحہ لکھا ہے جو زندہ انسان کو تو اہمیت نہیں دیتا لیکن مرنے کے بعد اس کے چند اوصاف بیان کر کے اپنی نیک نامی قائم کرنا چاہتا ہے۔ معاشرے کی منافقت اور چالاکیوں سے بے خبر ایک انسان جس کی زندگی اپنی اولاد کے کپڑوں اور فیسوں کو کمانے میں گزری ہے، اس کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھا کر اس سے غلط کاغذات پر دھوکے سے دستخط کروا لیے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے گیارہ سال تک اس شخص کی پنشن رکی رہی۔ ایک عام آدمی اور مزدور انسان جس کسم پرسی، غربت اور تنگ دستی میں زندگی گزارتا ہے، اس کا احساس کرنے کے لیے کوئی اس کا جائز حق دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ لوگ زندگی بھر اُس فرد سے اپنے کام نکلواتے رہے، اپنے مطلب کے لیے اس کے پاس درخواست لے کر آتے رہے، جس محکمے میں وہ کام کرتا تھا، وہاں سالوں اس کی تنخواہیں رکی رہیں، بیماری کی حالت میں مالی مسائل اور تنگ دستی سے لڑنے والے کی موت پر محکمے نے وہ رکی تنخوا اس کے لواحقین کے لیے جاری کر کے ثواب کمانے کی ایک بھونڈی کوشش کی۔ زندگی میں جس کے کام نہ آئے، مرنے پر اس کے گرد رو کر دنیا کو دکھانے کے لیے آ کھڑے ہوئے۔ سماجی منافقت کا یہ روپ شاعر کے دل پر گہرے چرکے لگاتا ہے اور یہ نوحہ ایک فرد کے نوحے سے ایک سماج کے نوحے میں بدل جاتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت کا اظہار جاوید انور نے اپنی ایک اور نظم ”عام آدمی کی موت پر“ میں بھی کیا ہے۔

وہ میرے شہر کا اک
گم نام آدمی تھا
اور خواب دیکھتا تھا
تیری غلاظتوں میں
مہتاب دیکھتا تھا
وہ خام آدمی تھا
اے بدلحاظ دنیا
میں جانتا تھا اُس کو
وہ تجھ کو چاہتا تھا
جیسے ہوا کے جھونکے

کو حبس چاہتا ہے

انسانی رویوں اور سماج پہ ان کے اثرات کا جائزہ جاوید انور کی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کی سرد مہری اور برف پگھلانے کے لیے بولنے اور بات کرنے، ایک دوسرے کے نظریات کو جاننے اور اختلاف رائے کا احترام کرنے کی کوشش ایک حساس انسان ہونے کی حیثیت سے ان کی شاعری کا بھی لازمی حصہ رہی۔ ان کی کتاب "بھیڑیے سوئے نہیں" میں ایک نظم ہے "باپ کے نام ایک باغی کا خط"۔ یہ نظم دیکھیں تو اس میں ایک بیٹا اپنے باپ سے براہِ راست مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ جو ہم نے دیواریں اٹھائی ہوئی ہیں مختلف قسم کی، رسم و رواج کی، یہ دیواریں عارضی ہیں، ان کے پیچھے سے جھانکا جا سکتا ہے۔ گویا بات چیت سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

نئے آدمی کا زندگی کے بارے میں جو نظریہ ہے وہ اس کی پچھلی روایتوں سے بغاوت کا علم ہو تا ہے۔ نیا آدمی دراصل ہر دور میں وہ فرد ہے جو فرسودہ روایتوں کے خلاف مزاحمت کی ریت نکالتا ہے۔ جاوید انور کی نظم "باپ کے نام ایک باغی کا خط" دراصل اسی نئے آدمی کی کہانی ہے۔ وہ باغی دراصل اپنے باپ کو اس کی جوانی کی مزاحمت یاد کرواتا ہے جو وقت کے سیلاب میں بہہ گئی اور سینے میں ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ وقت کی گردش میں ہر جوان کا علمِ بغاوت اس کے ہاتھوں سے کہیں غائب ہو جاتا ہے اور وہ خود ان حالات کا حصہ بن جاتا ہے جن کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے وہ کھڑا ہوا تھا۔ نظم کی چند سطریں درج ذیل ہیں:

وہ جو لش لش کرتا باغی
خون تھا میری شریانوں میں
شریانوں کی بھل ڈھوتا ہے
بجھے ہوئے بارود کی ڈھیری
خواہش میری، میرے جذبے
محوِ خواب ہیں، چربی اوڑھے
آج مجھے لگتا ہے جیسے
اک دن تُو بھی میری مانند
اپنے فولادی کندھوں سے
صدیوں کی میراث جھٹک کر
پاؤں پٹخ کر نکلا تھا پر
لمحوں کی زنجیر نہ ٹوٹی
لمحوں کی زنجیر کا رشتہ
صدیوں کی بیگار کا ورثہ
وقت کی اک اپنی بپتا ہے

ہم سب اس زنجیر کی کڑیاں
ہم سب اس دیوار کی اینٹیں
جسے گرانے کی کوشش میں
اونچا کرتے رہتے ہیں ہم
اس دیوار سے سر ٹکرانے
کل بھی کچھ بچے آئیں گے
جن کو روکنا چاہیں گے ہم
لیکن روک نہیں پائیں گے

جاوید انور کی شاعری کے ایک نئے پہلو کی طرف ان کے دوست اور شاعر حسین عابد ان الفاظ میں توجہ دلاتے ہیں:

> ”اس کی شاعری کی ایک نئی جہت جو اسے اپنے پیشے کے تعلق سے ملی وہ دانائی اور دیوانگی کی سرحد کے معاملات ہیں جو اس نے سائیکاٹرسٹ کے طور پر دیکھے، سمجھے اور اپنی طبیعت کی شدت و افتادگی میں جس طرح پھر اس نے انھیں نظم کیا، وہ جدید اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔“(۱۴)

”برزخ کے پھول“ میں ایسی کئی نظمیں شامل ہیں جو انسانی ذہن کی نفسیات اور نفسیاتی مسائل کو سمجھنے اور بیان کرنے کی ایک عمدہ کاوش ہیں۔ نفسیاتی امراض جن حالات کے تحت جنم لیتے ہیں، وہ سماج کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ انسانی ذہن اتنا پیچیدہ اور گنجلک ہے کہ اسے آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں۔ بعض اوقات یہ اپنے اردگرد کے ماحول سے فرار ہونے کے لیے اپنی ایک خیالی دنیا پیدا کر لیتا ہے۔ اور پھر وہ خیالی دنیا اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ اس کی حقیقی دنیا کو نگل لیتی ہے۔ ایسی صورت حال میں بہت سی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جاوید انور نے آسٹریا میں بطور نفسیات داں ڈاکٹر کافی عرصے تک کام کیا اور اس دوران طرح طرح کے مریضوں کا مشاہدہ کیا۔ انھوں نے اپنے ان تجربات میں سے بہت سے تجربات کو نظموں میں بھی ڈھالا ہے۔

شیزوفرینیا ایک ایسا اعصابی مرض ہے جس میں انسان کے دماغ اور جسم کے دوسرے حصوں کا آپسی رابطہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ دماغ اپنے اردگرد کے ماحول کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا اور باقی اعضا کو اس کے مطابق سگنل دیتا ہے۔ دماغ کی یہ الجھن مریض میں غصہ، گھبراہٹ اور چڑچڑاپن پیدا کرتی ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد کسی ایک موضوع پر بات کرتے ہوئے اچانک موضوع بدل دیتے ہیں۔ جاوید انور کی طویل نظم برزخ کے پھول عرف شیزوفرینیا اس مرض کی کئی جہتوں کا اظہار ہے۔ نظم کا مرکزی کردار ایک لڑکی ہے جو شیزوفرینیا کے مرض میں مبتلا ہے۔ یہ لڑکی ہمارے بیمار سماج کا ایک علامتی اظہار بھی ہے۔ اس نظم کے مرکزی موضوعات دورِ حاضر کا ماحول اور فرد پر اس کے اثرات کا ایک جائزہ ہے۔ نظم چھوٹے چھوٹے کئی حصوں میں تقسیم ہے اور ان میں کئی موضوعات پر شیزوفرینیا کے مریض کو دکھائی دینے والی خیالی دنیاؤں کی تصاویر ہیں۔ یہ تصاویر دراصل سماج میں انسان کی ذہنی ابتری اور مختلف موضوعات پر اس کی بھٹکی ہوئی ذہنی رو کی بھی نمائندہ

ہیں۔ علم دین اور اس کی تین کٹی انگلیاں، خود کشی کرنے والا تیرہ چودہ سالہ لڑکا، مادرزاد فرشتہ، جنسی بلوغت کا احساس، سانپ، لال آنکھوں والا بھیڑیا، رستہ بھولا ہوا شہزادہ، بگ بینگ، اسامہ بن لادن، اور کالا پتھر۔۔۔یہ تمام تصاویر برزخ کے پھول ہیں جنھیں سمجھنے کی کوشش میں انسانی ذہن مزید الجھا جاتا ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو!

گرم لہو کی خوشبو
سترہ گولیاں نیند کی
اور بھیڑیا
لال لال آنکھیں ہیں اس کی
سرخ کوئلے جیسی
دروازے میں کھڑا ہوا تھا
جب میں
چیخی
آج رات کو
ڈاکٹر صاب،
نرسیں
مجھے چڑیلیں لگتی ہیں اور آپ کے کندھوں
پر کبھی کبھی
کسی سؤر کا چہرہ ہوتا ہے!

نظم کے اس منظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مفلوج سماج میں آج کے دور کا انسان جن گھمن گھیریوں میں پھنسا ہوا ہے وہ اس کی دماغی ابتری کو ظاہر کرتا ہے۔

مجموعی طور پر جاوید انور کی نظمیں زندگی اور زندگی کی پہیلیوں کو سلجھانے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ سماجی شعور رکھنے والا ایک حساس شاعر جب اپنے معاشرے میں حبس کا موسم دیکھتا ہے تو وہ کُھل کر سانس نہیں لے پاتا۔ پھر اپنے احساس کو زبان دے کر سانس لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دور کے سیاسی و سماجی حالات کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد جاوید انور پر کئی تلخ حقیقتیں کھلتی ہیں جو کبھی افسوس کبھی حسرت اور کبھی غصہ بن کر نظموں میں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سب کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نظر نہیں آتا۔ یہی جاوید انور کی نظموں کا روشن پہلو ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عتیق اللہ: "ایک بے مرکز سماجی تشکیل اور جدید اُردو نظم" مشمولہ "نقاط" نظم نمبر، پورب اکادمی، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۰

۲۔ اختر حسین رائے پوری: "ادب اور انقلاب" ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد، (دکن) ۱۹۴۳ء، ص ۲۴

۳۔ علی سردار جعفری: "ترقی پسند ادب" انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۵۱

۴۔ رشید امجد: "شاعری کی سیاسی و فکری روایت" دستاویزِ مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۸،۲۹

۵۔ فیض احمد فیض: "میزان" کوہ نور آرٹ پریس، کلکتہ، ۱۹۸۲ء، ص ۳۱

۶۔ حسین عابد: (مضمون) "سمندر مرے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" مشمولہ سہ ماہی "تسطیر" (مدیر) نصیر احمد ناصر، جلد ۱۶، شمارہ: جنوری تا جون، ۲۰۱۲ء

۷۔ فرح عابد: "اُردو نظم کا فنی و فکری جائزہ" (مقالہ برائے ایم فل اُردو) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۹۸

۸۔ ڈاکٹر امجد طفیل: "ہم عصر اردو شاعری" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۲۷۵

۹۔ طارق ہاشمی: "جدید نظم کی تیسری جہت" شمع بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۱

۱۰۔ ڈاکٹر امجد طفیل: "ہم عصر اردو شاعری" ص ۲۷۵

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا: "شام کی منڈیر سے" مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۷

۱۲۔ ڈاکٹر عتیق اللہ: "ایک بے مرکز سماجی تشکیل اور جدید اُردو نظم" مشمولہ "نقاط" نظم نمبر، ص ۴۱

۱۳۔ ڈاکٹر شمیم حنفی: "اردو شاعری میں نئے رجحانات" مشمولہ "نقاط" نظم نمبر، ص ۳۰

۱۴۔ حسین عابد: (مضمون) "سمندر مرے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" مشمولہ سہ ماہی "تسطیر" (مدیر) نصیر احمد ناصر، جلد ۱۶، شمارہ: جنوری تا جون، ۲۰۱۲ء

باب چہارم

جاوید انور کی نظموں کے اسالیب

باب چہارم

جاوید انور کی نظموں کے اسالیب

زبان و بیان کے خصائص:

انسانی تہذیب و تمدن ہر عہد میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی ہے۔ ادب بھی اس ارتقا کا حصہ بنتا ہے۔ شاعری خصوصاً نظم کئی تعمیری اور تخریبی ادوار سے گزر کر آئی ہے۔ نظم کی زبان اس کے مجموعی تاثر میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو نظم نے اپنے ارتقا کی کئی منازل طے کرلی ہیں۔ نظمِ آزاد نے اپنا آپ منوالیا ہے اور اب نثری نظم بھی اس سفر پہ گامزن ہے۔ شاعری نہ محض قافیہ پیمائی نہ خیال آرائی، بلکہ ہر دو سطح پر مہارت ہی فنکار بناتی ہے۔ شاعری کے الہامی پہلو سے کسی کو انکار نہیں تاہم یہ تخلیقی واردات بھی تب ہی ممکن ہے جب ایک شاعر فکری اور فنی دونوں سمندروں کا غواص ہو۔ بعض اوقات ایک شاعر بہت بلند فکر کا مالک اور زبان پر دسترس رکھنے کے باوجود بھی ایسی فنی غلطیاں کر بیٹھتا ہے جو اس کی تخلیق کو شاہکار بننے سے روک دیتی ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عروضی مہارت رکھنے والا اور لسانیات کا ماہر اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ کسی عمارت کا نقشہ بنانے والا جو جمالیاتی شعور اور نظر رکھتا ہے وہ محض سیمنٹ سے اینٹیں جوڑنے والے مستری کی مہارت کے مقابلے میں کہیں مختلف ہے۔ اینٹیں جوڑنے کا دن اگرچہ آپ کو دیوار اٹھانے کی راہ سجھا دیتا ہے تاہم نقشہ گر بننے میں مددگار نہیں ہو سکتا۔ اس ہنر کے لیے جمالیاتی شعور، زیرک نظر، گہرا مشاہدہ اور طویل ریاضت بھی درکار ہے۔ شاعر کے ہاں بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ شاعر کی فنی مہارت اور زبان و بیان پر عبور کے حوالے سے فیض احمد فیض اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی ہے۔ اس پر فرض ہے گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں دجلہ کا مشاہدہ، ان کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر اس کا بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ہے۔"(۱)

لغت میں شعر کے معنی اگرچہ کلامِ موزوں ہے تاہم بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک طویل اور پیچیدہ بحث ہے۔ شاعری کے حوالے سے مختلف نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔ کسی نے شاعری کو احساس کی زبان سمجھا ہے اور کوئی اسے گنے چنے اصولوں کا پابند مانتا ہے۔ شاعری کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ ایک الہامی چیز ہے۔ انسانی ذہن جب اپنے شعور اور لاشعور کو ایک سطح پر جوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ ان سگنلز کو پکڑنے کی صلاحیت پیدا کرلیتا ہے جسے الہام کہتے ہیں۔ کائنات کے رازوں کی تلاش انسانی ذہن کی بنیادی فطرت ہے۔ شاعر کے ہاں یہ تلاش لفظِ موزوں کی تلاش ہے جسے وہ احساس کے پیکر پر سجا کے شاعری کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یوں تو خیالات ہر انسانی ذہن میں در آتے ہیں لیکن بروقت ان کی تصویر اتارنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ اس حوالے سے جس جمالیاتی ترفع کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک تخلیق کار اور

شاعر کے ہاں موجود ہوتا ہے۔ شاعر کا ذہن بروقت ان تاروں کو چھیڑ کر ایسے سر تخلیق کر لیتا ہے، دنیا جسے شاعری کے نام سے جانتی ہے۔اس حوالے سے جاوید انور کا ایک شعر ہے کہ:

کچھ ایسے سر ہیں پاگل کر دیتے ہیں
جاوید انور کچھ تار عجب ہیں من کے

شاعری جن اجزا سے ترتیب پاتی ہے ان کے بارے میں مختلف زبان دانوں کی مختلف آراء ہیں۔ تاہم چند بنیادی اجزا پر سبھی متفق ہیں کہ ان کے بغیر کوئی جملہ جملہ تو ہو سکتا ہے، شعر نہیں۔ اگر کسی خیال کو موزوں کر کے منظوم صورت میں پیش کیا جائے تو وہ دیکھنے میں شعر کہلائے گا، تاہم اس میں تاثر اور شعریت کا ہونا بھی لازم ہے۔ ورنہ قافیے ردیف کے تال میل سے دو تکنیکی مصرعے تو بن جاتے ہیں، شعر جنم نہیں لیتا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت بیان کرتے ہوئے کچھ شرائط پیش کی ہیں:

۱۔ تخیل

۲۔ کائنات کا مطالعہ

۳۔ تفحص الفاظ

تفحص الفاظ سے مراد الفاظ کا درست استعمال ہے۔ الفاظ کے درست چناؤ اور ترتیب کے بغیر ایک شاعر اپنا مافی الضمیر مؤثر انداز میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاعر اور غیر شاعر میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ایک ہی خیال کو شاعر عام آدمی کی نسبت زیادہ دلکش اور پر اثر انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خیال خواہ کتنا ہی بلند اور عظیم ہو، اگر وہ اظہار میں پیچیدہ اور گنجلک ہے تو سننے والوں پر دیر پا اثر نہیں چھوڑتا۔ شاعر کی زبان روزمرہ اور محاورہ کے قریب قریب ہونی چاہیے۔ محض اپنی علمیت جھاڑنے یا زبان و بیان پر عبور کا ثبوت دینے کے لیے اگر کوئی شاعر ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیچیدہ الفاظ استعمال کرے تو اس کی شاعری پر اثر نہیں رہتی۔ عمدہ الفاظ کے چناؤ کے لیے ضروری نہیں کہ شاعر لغت کے مشکل الفاظ کا انبار لگا دے بلکہ وہ عام فہم اور سادہ زبان استعمال کرتے ہوئے بھی شاعری کو پر کشش بنا سکتا ہے۔

شاعری ایک ایسا ہمہ جہت تخلیقی عمل ہے جس میں فکر اور فن ہر دو سطح پر مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایک چیز کی کمی دوسری کو بھی متاثر کرتی ہے۔ فکر کی بنیاد قوت متخیلہ پر ہے۔ یہ ہر شاعر کا ایک فطری ہنر ہے۔ تاہم فن ایک ایسا عمل ہے جس کے پیچھے مسلسل ریاضت اور وسیع مطالعہ موجود ہوتا ہے۔ شاعری کی تکنیک، ہیئت اور آہنگ ایسے اجزائے ترکیبی ہیں جنھیں شاعر کو بہر حال سیکھنا ہی پڑتا ہے۔ شاعری کی تکنیک میں زبان و بیان، الفاظ کا موزوں انتخاب اور مناسب دروبست، زبان کے قواعد و ضوابط، ردیف، قافیہ، بحر، وزن اور شعری بناوٹ کے تمام جملہ لوازمات شامل ہیں۔ البتہ ان تمام لوازمات کے استعمال سے فکر و معنی کی مکمل ترسیل بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ”تجربہ شاہد ہے کہ اگر ایک اچھے شعر میں کسی ایک لفظ کے بجائے اس کا مترادف لفظ
> رکھ دیں تو شعر کا مفہوم تو شاید برقرار رہے لیکن اس کی ساری پراسراریت غائب

ہو جائے گی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر لفظ کا ایک مزاج ہوتا ہے جو ایک خاص وژن کے مزاج کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور جب اس کے بجائے کوئی اور مترادف لفظ استعمال کیا جائے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا اور یوں شعر کی جاذبیت برقرار نہیں رہتی۔ چنانچہ ہر اچھا شاعر ایک جوہری کی طرح الفاظ کے نگینوں میں سے وہی نگینہ منتخب کرتا ہے جو زیور میں نصب شدہ نگینوں کی مجموعی کیفیت سے ہم آہنگ ہو۔"(۲)

بیسویں صدی اردو نظم کی صدی ہے۔ اس صدی میں نظم نے پھلنا پھولنا شروع کیا اور اپنے شباب تک پہنچی۔ اس صدی میں نظم کے بڑے بڑے نام پیدا ہوئے۔ نظم نے اپنے قدیم عہد سے جدیدیت کی طرف سفر کیا۔ آزاد اور معری نظم نے اردو شاعری میں جگہ بنائی۔ میرا جی، ن م راشد، فیض احمد فیض، مجید امجد، اختر الایمان، اور اختر حسین جعفری جیسے نظم نگاروں نے نظم کے اسلوب، ہیئت اور موضوعات کو وسعت دی۔ پھر نثری نظم کا رجحان بھی پیدا ہوا جو اپنے آغاز میں اگرچہ قبولیت کی سند حاصل نہ کر سکا تاہم آہستہ آہستہ اس نے اپنے قدم جما لیے اور اظہار کے کینوس کو وسعت دے کر اس میں نئے رنگ بھرنے شروع کیے۔

ہر شاعری کی صنف اپنے دور کے حساب سے فکری مسائل، زبان و بیان کا انداز اور کرافٹ لے کر آتی ہے۔ نظم ایک ایسی صنف ہے جس میں بے شمار تجربات کیے گئے۔ شروع میں انھیں اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا پھر وہ فنی پختگی حاصل کر کے مقبول ہو گئے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ اپنے ایک مضمون میں ہر نئے ادبی تجربے کی بابت بیان کرتے ہیں:

"اپنے ابتدائی مرحلے میں ہر ادبی تجربہ انتہائی نامانوس، قطعاً نیا اور حواس کے یک لخت بھک سے اڑا دینے والا ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی نامانوسیت محو ہو جاتی ہے اور ہم اسے انگیز کر لیتے ہیں کیوں کہ لسانی، ساختی یا ہئیتی شکست و ریخت کی پھر ایسی صورتیں واقع ہونے لگتی ہیں جو گذشتہ تجربوں کے مقابلے میں زیادہ انکار و استرداد کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔"(۳)

جاوید انور کی نظموں کے اسالیب:

اگرچہ جاوید انور نے کئی اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی تاہم نظم ان کا ترجیحی اظہارِ سخن رہی ہے۔ انھوں نے ابتدا میں غزلیں بھی کہیں۔ نظموں میں پابند، آزاد، معری اور نثری نظمیں بھی کہیں تاہم جاوید انور کے ہاں ہمیں آزاد نظم ہی راج کرتی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر آزاد نظم ان کی شاعری کا چہرہ ہے۔ اپنی آخری کتاب "برزخ کے پھول" میں البتہ انھوں نے نثری نظم کے لیے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ ڈھیروں اہلِ سخن کے درمیان اپنا ایک الگ فکری، تخلیقی اور اسلوبی نظام بنانا اور اس کی پہچان میں کامیاب ہو جانا بہت بڑی بات ہے۔ الفاظ کے موزوں اور بر وقت استعمال کا سلیقہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جاوید انور نے اپنے ابتدائی زمانے میں جن سینئر شعرا کو پڑھا اور ان کی صحبت میں وقت گزارا ان کی

کچھ نہ کچھ جھلک ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ تاہم یہ محض ایک جھلک تک ہی محدود ہے۔ اپنی پہلی کتاب آنے تک جاوید انور نے اپنا ایک اسلوب وضع کر لیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہو تا گیا۔ ان کی نظموں میں کرافٹ اور شعریت دونوں ہی اپنی بہترین شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس کے پیچھے محض شاعر کی خداداد صلاحیت نہیں بلکہ ایک طویل ریاضت اور گہرا مطالعہ بھی شامل ہے۔ جس طرح سونا آگ میں پک کر کندن ہو تا ہے اسی طرح شاعر بھی ریاضت کی بھٹی میں تپ کر ہی شاہکار تخلیق کرنے کے قابل ہو تا ہے۔ جاوید انور کی اس محنتِ شاقہ کا ثبوت ان کی نظمیں بھی ہیں اور وہ تمام دوست احباب بھی جو جاوید انور کے شعری سفر میں ان کے ہمراہ چشم دید گواہ کے طور پر موجود تھے۔

جاوید انور کی شاعری کے جنون کے حوالے سے ان کے ایک دوست حسین عابد لکھتے ہیں کہ:

"جاوید کے سرہانے قدیم و جدید شاعری کی کتابیں بدلتی رہتی تھیں۔ وہ الماریوں کے کواڑوں اور کمرے کی دیواروں پہ شعر لکھتا رہتا۔ اس کی نئی تخلیق کا سب کو انتظار رہتا۔ وہ جب اپنے طویل قدموں سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نیم طنزیہ مسکراہٹ سے اپنی نئی غزل یا نظم سناتا تو سب لوگ اپنی فقرہ بازی بھول کر ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ یہ اسی کی دہائی کا وسط تھا اور اختر حسین جعفری کا علامتی اسلوب جدید نظم کی پہچان بن چکا تھا۔ بہت سے دوسرے نوجوان لکھاریوں کی طرح جاوید انور کی اس زمانے کی نظموں میں بھی اختر حسین جعفری کا رنگ چھلکتا نظر آتا ہے۔ لیکن اس اثر کا زمانہ مختصر رہا اور جاوید کی لگن اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے اسے خیال و اظہار کی نت نئی دنیاؤں کی دریافت میں مصروف رکھا۔" (۴)

جاوید انور کے بعض دوستوں کے مطابق ان کی ابتدائی شاعری پہ اختر حسین جعفری کی چھاپ نظر آتی ہے تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ دھندلی ہوتی گئی اور انھوں نے اپنا ایک منفرد لب ولہجہ بنالیا۔ اختر حسین جعفری اپنے دور کے ایک اہم ترقی پسند شاعر تھے اور ان کی شہرت ان کی مزاحمتی شاعری کے حوالے سے ہے۔ چونکہ ایک سچا ادیب یا شاعر اپنی فرسودہ روایات یا معاشرتی بگاڑ کے خلاف مزاحمت کرتا اور صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اس لیے یہ مشترکہ خوبی جاوید انور کی ابتدائی نظموں کو اختر حسین جعفری کی نظموں سے مماثل کرتی ہے۔ اس حوالے سے جاوید انور کے دوست اور شاعر ثاقب ندیم کی رائے کچھ یوں ہے:

"جاوید سے میری دوستی ۱۹۸۲ میں ہوئی اس سے پہلے سے وہ عمدہ نظم کہہ رہا تھا۔ میرے سامنے احمد ندیم قاسمی صاحب نے اسے فنون میں چھاپا۔ اور مسلسل چھاپا۔ اس کے علاوہ ادبیات میں چھپا اور پھر اس وقت کے تقریباً سبھی اہم رسائل نے اس کی تخلیقات کو جگہ دی۔ اس کو ہم اسی کی دہائی کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ کسی بھی شاعر کو اپنی روایت سے واقفیت کے بعد ہی کوئی راہ نکالنا ہوتی ہے اور ایسی نامہرباں گھڑیوں میں اپنی پیش رو روایت کے اثرات کسی بھی شاعر پر ناگزیر ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شہر

میں شام میں موجود چند ایک نظموں سے کبھی مجھے راشد اور کبھی اختر حسین جعفری کے احساس کا شائبہ ہوا جس کا ذکر میں نے جاوید انور سے بھی کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ان شعرا کے ساتھ جاوید انور کو بریکٹ کرنا ایک واضح غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جاوید کے ہاں موضوعات اور ان کے لیے استعمال کی گئی ڈکشن مذکورہ شاعروں سے جاوید کی شاعری کو دور لیے جاتے ہیں۔"(۵)

شاعری کی زبان کے سب سے اہم پہلو اس کی جمالیات اور تاثیر بیان ہیں۔ شعر کا موضوع خواہ کوئی بھی ہو، اس کا اظہار اور نظم کہنے کا انداز اس موضوع کو پر تاثیر بنا دیتا ہے۔ الفاظ کو ایک لڑی میں پرونے کا ہنر آتا ہو تو ان کی موزونیت اور حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جاوید انور کے ہاں ہیت کا تنوع بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اکیسویں صدی کے مزاج کے مطابق ڈھالا ہے۔ ان کے سیاسی و سماجی شعور نے ان کی شاعری کی ایک شکل متعین کی ہے۔ ان کے ہاں نئی تشبیہات و استعارات اور علامتیں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے پابند، آزاد اور معری ہر طرح کی نظمیں کہیں۔ تاہم ان کی بیشتر نظموں میں صوتی آہنگ نظر آتا ہے جو قاری کو نظم پڑھتے ہوئے لطف دیتا ہے۔ نظموں میں لمبے اور چھوٹے دونوں طرح کے مصرعے پائے جاتے ہیں جو نظم کو ایک متوازن شکل میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی کئی طویل نظموں میں تلازماتی نظام اس قدر مضبوط ہے کہ شروع سے آخر تک قاری کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا اور وہ کہانی کے ایک سرے کو دوسرے سرے سے با آسانی جوڑ لیتا ہے س حوالے سے ان کی نظموں "نیا تماشا"، رات کی حمد اور "چھبیسویں سالگرہ پر طویل خود کلامی کی مثال دی جا سکتی ہے۔

جاوید انور کے ہاں کہیں ہمیں پیچیدہ استعاراتی اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے اور کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو اپنے اظہار اور ابلاغ میں بہت واضح اور آسان ہیں۔ دونوں طرح کی نظمیں شاعر کے مزاج کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ نظم کی ضرورت کے مطابق اس کا ماحول بنانے پہ قادر ہے۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو قاری اور نقاد کو اپنے شعری مزاج کے لیے نئی لگتی ہیں گویا وہ تنقید و تعریف کے نئے سانچے وضع کرنے پہ مجبور کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم جس کا عنوان بھی طویل ہے، "یہ اینزائموں ہارمونوں کی دنیا کا محکوم دل"۔ اس نظم میں انھوں نے بطور ایک ڈاکٹر دل کی ظاہری ساخت کو اس کے جذبات کے ساتھ جوڑ کر ایک دلچسپ ردھم بنایا ہے۔ نظم میں تکنیکی الفاظ ہیں جو شاید طب سے وابستہ فرد ہی آسانی سے سمجھ سکتا ہے یا انسانی اعضا کی بنیادی سائنس کا علم رکھنے والا جان سکتا ہے لیکن ایک عام قاری بھی ذرا سی کوشش سے نظم سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ نظم کو ایک پیراگراف کی صورت میں لکھ کر انھوں نے اس کے چھوٹے بڑے مصرعوں کو ایک ردھم میں جوڑ دیا ہے۔ نظم کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

ٹھکا ٹھک ٹھکا ٹھک
ہتھوڑا نہیں ہے یہ گھوڑا نہیں ہے یہ دل ہے
نمک کے سمندر پہ ٹھیری ہوئی
گا ہے بہتی ہوئی ریتلی بے ازل کائناتوں کی جو پسلیوں کو فلک جانتی ہیں

لگاموں میں جکڑا ہوا
پانیوں کے ہواؤں کے مٹی کے دوزخ سے رِستے ہوئے آنسوؤں کا ذخیرہ کیے
ایک ننھے سے فرعون کے جو ادھر کھوپڑی میں پڑا رات دن
دم بدم گنجلوں کی رہائی کے احکام جاری کیے جا رہا ہے!

نظم میں شاعر نے دماغ یعنی عقل کو دل کے مقابلے میں فرعون کا خطاب دیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کے ہاں عقل و دل کے موازنے میں دل کو برتری حاصل ہے۔ رگوں کے جال میں پھنسا ہوا یہ ایک عضو اگرچہ ہارمونز اور اینزائمز کا محکوم ہے لیکن دماغ کی نسبت اس میں زیادہ خیر اور درستی پائی جاتی ہے۔ شاعر کا یہ موازنہ اس احساس کی بھی نشان دہی کرتا ہے جو ہر دردِ دل رکھنے والا انسان محسوس کرتا ہے اور تخلیق کار کے ہاں اس کی شدت بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ نظم کا رنگ و آہنگ شاعر کی شاعرانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جاوید انور کا شعری آہنگ اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں شاعری کے الفاظ میں صوتی مناسبت کی ضرورت کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا بلند آہنگ بھی شاعری کے بنیادی مزاج کا خیال رکھتا ہے اور نظم پڑھتے ہوئے ہمیں وہ محض ایک چیخ نہیں لگتی۔

جدید نظم میں ایمائیت، ابہام، اشارہ، کنایہ، مجازِ مرسل، علامت اور پیکریت ملتی ہے۔ یہ چیزیں اگرچہ ہر دور میں شاعری کی بناوٹ کا حصہ رہی ہیں تاہم جن حالات میں کسی معاشرے میں گھٹن اور خوف کی فضا کا بادل گھنا رہا، ایسی جگہوں پر تخلیقی اظہار میں بھی دباؤ اور گھٹن کا عکس نظر آیا۔ شاعر چوں کہ فطرتاً ایک آزاد انسان ہوتا ہے اس لیے وہ ہر گھٹن کے ماحول میں بھی اپنے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد خصوصاً مارشل لا کے زمانوں میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں ابہام، اشاری کنایہ اور علامت کا راستہ اپنا لیا۔

تشبیہات و استعارات اظہارِ سخن کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ کسی شاعر کے ہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال اس کے مزاج، مطالعہ اور زبان پر دسترس کو ظاہر کرتا ہے۔ استعارہ، علامت اور محاوروں کا برمحل استعمال شعر کو فنی لحاظ سے پختہ اور خوب صورت بناتا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ الفاظ کی یکسانیت سے جلد اکتا جاتا ہے۔ ایسے میں ان مجازی الفاظ کا استعمال اس کی بات میں انفرادیت اور نیا پن پیدا کرتا ہے۔

استعارات کا استعمال جہاں ایک طرف شاعر کی زبان پر مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے وہیں اس ماحول اور معاشرے کے مزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے جس میں ایک شاعر کو اپنے خیال کا اظہار کرنا ہے۔ بعض اوقات سماجی رویے استعاراتی زبان استعمال کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں شعرا نے ایک اور راستہ بھی دریافت کیا جسے علامت نگاری کہا جاتا ہے۔ علامت استعارہ کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ کسی شاعر کا شعور اسے مخصوص ماحول اور حالات میں جن الفاظ کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا، وہاں وہ علامت کے ذریعے اپنے اظہار کی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ علامت کے متعلق فیض احمد فیض نے اپنے ایک مضمون "جدید اردو شاعری میں اشاریت" میں لکھا ہے کہ:

"علامت سے ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں جنھیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے

لیے استعمال کرتا ہے، جس طرح ہم کسی ایک لفظ کو اصطلاح قرار دے کر اس کے خاص معنی مقرر کر لیتے ہیں خواہ اس کا مفہوم کچھ ہی کیوں نہ ہو اسی طرح شاعر اور اس کے سننے والے میں ایک مفاہمت سی ہو جاتی ہے۔" (۶)

جاوید انور کی نظموں میں علامتی اظہار ضیاؑ دور کے مارشل لا کی دین تھا۔ ان کی نظموں میں کہیں کہیں بہت کھر درے الفاظ بھی آئے ہیں تاہم یہ اس سیاسی گھٹن کا نتیجہ ہیں جو اس ملک کو مارشل لا اور اس کے بعد کے دنوں میں بھی در پیش تھی۔ جب ہم نظم کا پسِ منظر اور شعری فضا دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ الفاظ نامانوس نہیں لگتے۔ ان کی نظموں میں کچھ الفاظ اور علامتیں بار بار دیکھنے کو ملتی ہیں جو ان کے مجموعی شعری مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کی پہلی اور دوسری کتاب کا مزاج ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم پہلی کتاب میں ان کی احتجاجی صدا ملکی سطح تک محدود ہے جب کہ دوسری کتاب "بھیڑیے سوئے نہیں" میں اس احتجاج نے عالمی سطح پر ہونے والے مظالم کو بھی اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ اس کتاب کا لہجہ اور آہنگ بلند اور قدرے تلخ ہے۔ اس تلخی میں بعض اوقات ایسے الفاظ بھی نظم میں در آتے ہیں جو عام طور پر نظم کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تاہم انھوں نے ان الفاظ کو بھی یوں برتا ہے کہ وہ نظم کے مضمون اور مزاج میں گھل مل سے گئے ہیں۔ مثلاً ان کی نظموں میں ہمیں بھیڑیا، خارش زدہ حیوان، بھونک اور اس جیسے کئی الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ الفاظ ایک عام آدمی کے شدید مایوسی اور بے بسی میں کہے گئے الفاظ ہیں۔ جب وہ بھیڑیوں کا کچھ بگاڑ نہیں پاتا تو بے بسی اور افسوس کے عالم میں ان الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

شاعری میں بھیڑیے کو استعمار کی علامت کے طور پر کئی جگہ برتا گیا ہے۔ جاوید انور کے ہاں یہ علامت ہمیں بار بار نظر آتی ہے۔ وہ ہر استعماری طاقت کو بھیڑیا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں خواہ وہ طاقت عالمی سطح پر ہے، ملکی یا مقامی سطح پر۔ انھیں عام انسانوں میں بھی جابجا بھیڑیے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے کے سونے کے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔ جاوید انور کی اس ترکیب کے بارے میں ناصر عباس نیر نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ:

"بھیڑیا مقامی ہے، یا غیر ملکی، وہ صرف وحشت انگیز طریقے سے غرا سکتا ہے۔ چوں کہ بھیڑیے گنگنا نہیں سکتے، نہ گنگنانے کا، مفہوم سمجھتے ہیں، اس لیے شاعر کے پاس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔" ان کی نظم بھونک کا یہ ٹکڑا دیکھیے!

بھونک اس شہرِ ستم کی بے وفا گلیوں میں جب کے مدرسوں\
میں کھڑکیاں ہیں اور نہ روشن دان\
مسجدیں شامِ غریباں، روشنی غارِ حرا میں قید ہے\
بو جہل اور بو لہب کی چھاتیوں پر تمغہء جرات سجے ہیں\
بھونک\
اے خارش زدہ حیوان!\
بھونک\
بھونک ان کے واسطے جو بھونک بھی سکتے نہیں!!

اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے استعماریت داخلی، نفسیاتی اور مقامی بھی ہے جس نے یہاں کے انسان کو "خارش زدہ کتا" بناڈالا ہے۔ اگرچہ چھپکلی ہو یا خارش زدہ کتا دونوں انسان کی منفی کایا کلپ کی علامت ہیں مگر جس اذیت کا تجربہ خارش زدہ حیوان کرتا ہے، چھپکلی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ خارش زدہ حیوان اذیت کے علاوہ شدید اضطراب سے بھی گزرتا ہے، یہی اذیت و اضطراب اسے خاموش نہیں رہنے دیتے۔ جاوید انور نے بھونک کو اظہار کی کم ترین سطح کا استعارہ بنایا ہے۔ جاوید انور کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کم ترین اظہار کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔" (۷)

شاعری میں تراکیب کا استعمال یا تراکیب سازی شاعر کی زبان پر دسترس کا ثبوت دیتی ہے۔ تراکیب کے استعمال سے شاعر کے رجحان کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے ہاں عربی یا فارسی یا کس زبان کی تراکیب اور الفاظ زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً اقبال کے ہاں فارسی تراکیب کا بہت زیادہ استعمال ملتا ہے جس سے ان کے فارسی رجحان اور اس زبان پر عبور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کچھ شعرا کے ہاں کچھ مخصوص تراکیب کا زیادہ استعمال نظر آتا ہے جو ان کا اسلوب بن جاتا ہے۔ بعض اوقات شعرا کسی لفظ یا ترکیب کو کسی خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ الفاظ یا تراکیب ان مخصوص چیزوں یا نظریات سے جڑ جاتی ہیں۔ جیسے اقبال کے ہاں ہمیں شاہین کا لفظ مردِ مومن کے لیے استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ اسے ترکیب سازی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک شاعر کے اسلوب کی انفرادی پہچان بناتی ہے۔

جاوید انور کے ہاں بھی کچھ الفاظ و تراکیب کی تکرار نظر آتی ہے جو ان کے مزاج اور اسلوب کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں ہمیں کئی منفرد تراکیب دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

دستکِ مرگِ مسرت، ازل آشنا کھنڈر، رنگِ بصارت، پارہ ابرِ پیاس، صدائے نامعتبر، سر بریدہ حروف، بحرِ شب زاد، نوائے گمراہَ شب، رمزِ دروغ، نوحہ برگِ زرد، گونگا پیمبر، چراغِ چشمِ گربہ سیہ، سیاہِ کج کلاہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا تراکیب میں سے بیشتر کا مزاج بھی وہی علامتی ہے جو اس دور کا مطالبہ تھا۔ جن حالات میں ہر دستک، دستکِ مرگِ مسرت" تھی اور ہر صدا، صدائے نامعتبر، ان حالات کی سنگینی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ملکی فضا میں یہ خوف اور جبر ایک طویل عرصے تک جاری رہا اور اب بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ سو موجودہ قاری کا ان تراکیب کو سمجھنا مشکل نہیں نہ ہی ان کا پسِ منظر اس کے لیے اجنبی ہے۔

شعر کی زینت بڑھانے کے لیے صنائع بدائع کا استعمال بھی نہایت اہم ہے۔ صنائع وہ لفظی مہارت ہے جس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں صنائع کی کئی صورتیں ہیں جن میں صنعتِ ایہام، صنعتِ حسنِ تعلیل، صنعتِ لف و نشر، صنعتِ تجنیس اور دیگر کئی شامل ہیں۔ ان کا استعمال ہر شاعر کی پسند ناپسند اور مزاج پر منحصر ہے۔ تاہم کئی صنعتیں شاعروں کے ہاں زیادہ استعمال ہوتی ہیں جن میں صنعتِ تکرار، تضاد اور تلمیح شامل ہیں۔

صنعتِ تکرار میں کسی لفظ کی تکرار سے آوازوں کی موسیقی اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ آوازوں سے پیدا ہونے والی یہ موسیقیت سننے والے پر خاص اثر ڈالتی ہے اور شاعری کے خارجی حسن میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ عربی مقولہ ہے کہ چیزیں اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے دن رات، خیر و شر، سیاہ و سفید اور ایسے کئی الفاظ اپنے متضاد کے ساتھ ایک مماثلت

پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک شاعر اپنے معاشرے اور ارد گرد کے ماحول میں موجود چیزوں کا موازنہ اور مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے لیے اسے صنعتِ تضاد کے استعمال کی کئی جگہ ضرورت پڑتی ہے۔ جاوید انور کی شاعری سے صنعتِ تضاد کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

مانا کہ میرے شہر کی تقدیر اور ہے
پر تیرے خواب اور ہیں تعبیر اور ہے
اک تو کہ ساری عمر ہنساتا رہا ہمیں
اک ہم کہ تیرے واسطے رو بھی نہیں سکے
نصیب جاگے تو ان کے جو سو رہے تھے ابھی
ہنر ہوا ہے یہاں دست، بے ہنر رکھنا
ایک آنگن قہقہوں اور سسکیوں سے بے خبر
چھت پہ اک پرچم پھٹا سا اور در پر فاختہ

جاوید انور کے دوست اور نظم کے عمدہ شاعر جناب حسین عابد، جاوید انور کی نظموں کے اسلوب کے بارے میں یوں گویا ہیں:

"گو جاوید انور کا اسلوب بنیادی طور پر نظم کے اسی مین سٹریم اسلوب کا تسلسل ہے جو فیض، راشد اور مجید امجد کی قائم کردہ روایت ہے لیکن یہ اس کا مخصوص لہجہ اور استعارات، تماثیل اور امیجز کی جدت ہے جو اس کی انفرادیت وضع کرتے ہیں۔ جاوید سے ایک نسل سینئر نظم نگار جیسے افتخار جالب، انیس ناگی اور قمر جمیل نے روایت کے مرکزی دھارے سے یکسر انحراف کیا اور اپنی اپنی جگہ ایک بالکل نیا اسلوب اپنایا، جاوید نے یہ رستہ اختیار نہیں کیا گو کہ اس کے آخری مجموعے برزخ کے پھول میں ہمیں ایسی نظمیں ملتی ہیں جو اپنی تکنیک اور پیرائے میں مرکزی دھارے سے بالکل مختلف ہیں لیکن یہ اس کے اپنے اسلوب ہی کا ارتقا ہے نہ کہ ایک قطعی مختلف طرزِ بیان۔ جاوید انور کے اسلوب کی انفرادیت اس کے لہجے میں غصہ اور مایوسی کا وہ مرکب ہے جو ضیا الحق کے مارشل لا کی دین ہے۔ سرخوشی، آزادی اور امید اس کے ہاں بہت کم ملتے ہیں۔ ایک مایوس نامرادی، زیاں، جبر کی فضا اور فنائیت اس کے لہجے کا خاصہ ہیں۔ شہر میں شام کی نظموں میں وہ ایک اینگری ینگ مین کے روپ میں نظر آتا ہے۔ یہ کڑوا احتجاجی طرزِ بیان کافی حد تک اس وقت لائل پور کے مجموعی شعری رویے سے سیراب ہوا اور مارشل لا کے خلاف جاری تحریکیں اور ان تحریکوں کو کچلنے کے لیے کیے گئے تشدد کے خلاف احتجاج کی مجموعی فضا اس اسلوب کی تشکیل کے بنیادی عناصر ہیں۔

اشکوں میں دھنک میں اسی اسلوب کا تسلسل نوزائیدہ بیٹی کی موت کے دکھ سے مزید کربناک صورت اختیار کرتا ہے۔ بھیڑیے سوئے نہیں کا شاعر پاکستان سے نکل کر یورپ میں آباد ہو چکا ہے۔ اب اس کا کینوس وسیع ہے۔ وہ ہئیت میں بھی تجربے کرتا نظر آتا ہے اور متن میں بھی لیکن شاعر نے یکدم کوئی نیا طرزِ اظہار اختیار نہیں کیا، البتہ مجموعی طور پر وہ اپنے

اسلوب کی اگلی جدید شکل میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ یورپی زندگی اور مطالعے کی وسعت کی دین ہے۔

برزخ کے پھول میں اسلوب کی یہ جدت مزید نکھرتی نظر آتی ہے اور کسی حد تک یوں لگتا ہے کہ شاعر آزاد نظم سے نثری نظم کی طرف مائل ہونے کو پر تول رہا ہے۔

جاوید انور کی زبان اعلیٰ ادبی زبان اور گلی محلے کی عمومی زبان کا بہت ہی خوب صورت مرکب ہے۔ وہ نہ بہت مرصع و مسجع زبان استعمال کرتا ہے نہ ہی بالکل عامیانہ۔۔۔ بلکہ عہدِ حاضر کے مسائل کیترجمان ایک ایسی زبان تخلیق کرتا ہے جو میں وہ ذاتی واردات اور کربِ زمانہ دونوں کو پورے ابلاغ کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ وہ الفاظ کے چناؤ میں بہت احتیاط اور درستی کا قائل تھا اور اس کی شاعری کا حسن الفاظ کے ایسے درست چناؤ کا ہی مرہونِ منت ہے۔"(۸)

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض: "دستِ صبا" ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۸

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا: "تخلیقی عمل" مکتبہ اردو زبان، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۴

۳۔ ڈاکٹر عتیق اللہ: "ایک بے مرکز سماجی تشکیل اور جدید اُردو نظم" مشمولہ "نقاط" نظم نمبر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۳۸

۴۔ حسین عابد: (مضمون) "سمندر مرے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" مشمولہ "جنگ اخبار" س ن، ص ۴

۵۔ ثاقب ندیم: (مضمون) "سمندر ترے بادبانوں میں سویا ہوا ہے" غیر مطبوعہ

۶۔ شاہد ماہلی: "فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں" اصلیہ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۷۲

۷۔ ناصر عباس نیئرؔ: "معاصر پاکستانی نظم، نو آبادیات اور روایت کی بازیافت" ص ۲۶۶

۸۔ حسین عابد، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۲۵ مارچ ۲۰۲۴ء، وقت سات بجے شام

ماحصل

ماحصل

اردو شاعری میں نظم کی صنف باقی اصناف کے مقابلے میں ہمیشہ مقصدیت کے زیادہ قریب رہی ہے۔ سیاسی و سماجی پہلو ہوں یا معاشرتی و معاشی موضوعات، نظم نے ہمیشہ ان پر کھل کر بات کی ہے۔ اظہارِ سخن میں نظم کا دامن غزل کے مقابلے میں کہیں وسیع ہے، یہی وجہ ہے کہ شعرا نے معاشرے کے مسائل پر آواز اٹھانے اور اربابِ اقتدار کے خلاف احتجاجی صدا بلند کرنے کے لیے ہمیشہ نظم کو ہی فوقیت دی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملک کو درپیش حالات نے جہاں عام عوام کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کیے وہیں تخلیق کاروں اور فن کاروں کے احساس پر بھی گہری چوٹ لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ادب اور شاعری میں بڑے بڑے نام پیدا ہوئے۔ نوے کی دہائی میں اردو نظم کے جو نمایاں نام ابھر کر سامنے آئے ان میں جاوید انور کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

جاوید انور نے اگرچہ غزل کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی تاہم نظم ان کا اصل ہنر اور دلچسپی تھی۔ اس لیے بعد میں وہ غزل کی نسبت نظم سے زیادہ قریب رہے۔ سرگودھا سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر جاوید انور صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ سرگودھا، لائل پور (موجودہ فیصل آباد) اور لاہور کی ادبی نشستوں اور ادب پرور محفلوں میں گزرا۔ شاعری سے گہرے لگاؤ، ادبی محفلوں اور اپنے دور کی اہم ادبی شخصیات کی صحبت نے جاوید انور کے شعری فن اور ہنر کو خوب چمکایا۔ انھوں نے نظم میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ جاوید انور نے نظم کی چار کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ نظم کے میدان میں ان کی ایک کتاب مشترکہ شعری تجربے کے طور پر بھی سامنے آئی۔ جس میں انھوں نے اپنے دو دوست شعرا حسین عابد اور قمر مسعود کے ساتھ مل کر مشترکہ نظمیں کہیں۔

جاوید انور کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی نظموں میں موجود گہرا اور دوررو سیاسی شعور دیکھنے کو ملا۔ ان کی نظر نہ صرف قومی اور ملکی سیاست پر تھی، بلکہ ایک طویل عرصہ ملک سے باہر رہنے اور دیگر ملکوں میں سفر کی بدولت بین الاقوامی سطح پر بھی ان کا سیاسی شعور پختہ ہو گیا۔ ان کی نظمیں ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا آئینہ ہیں۔ انھوں نے مارشل لاء کے دور میں آنکھ کھولی جب ادب اور ادیب بے جا پابندیوں کا شکار تھے۔ معاشرے کے کسی فرد کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ لوگ سیاسی جبر اور گھٹن کا شکار تھے اور ان کے دلوں میں خوف و ہراس تھا۔ ان حالات میں ادیب اور شاعر جو کہ معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے، کے کاندھے پر بھاری ذمہ داری آن پڑی تھی کہ وہ لوگوں کے مسائل کو قلم کی زبان سے سب کے سامنے لائے۔ اس دور کے تقریباً سبھی ادیبوں اور شاعروں نے یہ ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔ جاوید انور نے بھی اپنے سیاسی شعور کو نظموں میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کی صدائے احتجاج ان کے عہد کی نمائندگی کرتی ہے اور ہمیں اس دور کے سیاسی حالات کی تصاویر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کی پہلی دو کتابیں خصوصی طور پر ملکی و بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر کو ظاہر کرتی ہیں۔

ادب اور سماج کا تعلق بڑا اٹوٹ اور گہرا ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر اپنے سماج سے کٹ کر کوئی چیز تخلیق نہیں کر

سکتا۔ چوں کہ وہ سماج کا ایک فرد ہوتا ہے تو اس کا فن بھی سماجی حالات و واقعات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ معاشرے کا جائزہ لینے کے لیے ادیب اور شاعر کی عینک بیک وقت دوربیں اور خوردبیں کے طور پر کام کرتی ہے۔ وہ ظاہری مسائل کے ساتھ ساتھ ان خرابیوں کو بھی دیکھ لیتا ہے جو ایک معاشرہ پردے کے پیچھے چھپا کر رکھتا ہے۔ جاوید انور بھی گہرا سماجی شعور اور وسیع نظر رکھنے والے شاعر تھے۔ اپنے معاشرے کی مشکلات اور مسائل کو انھوں نے صرف زبان دی بلکہ اس کے حل کے لیے ہر ممکن عملی کوشش بھی کی۔ غربت وافلاس، بے روزگاری، طبقاتی کشمکش، مذہبی اور مسلکی تعصبات، جدید دور کے انسان کی تنہائی اور ناسٹلجیا اور ٹیکنالوجی کے انسانی زندگی پر اثرات وہ موضوعات ہیں جو جاوید انور کی نظموں میں ہمیں بار بار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک حساس دل انسان تھے اور مسیحائی کے پیشے سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کا لوگوں اور ان کے مسائل سے بھی واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ایک طویل عرصہ انھوں نے آسٹریا میں بطور ماہرِ نفسیات بھی کام کیا اور انسانی نفسیات اور اس کے عوارض کا بغور جائزہ لیا۔ اس ضمن میں بھی ان کا گہرا مشاہدہ اور تجربہ ان کی کئی نظموں میں نظر آتا ہے۔ ان کی آخری کتاب برزخ کے پھول کا ایک بڑا حصہ ایسی نظموں پر مشتمل ہے جو انسانی نفسیات اور اس کی کئی بیماریوں مثلاً شیزوفرینیا میں مبتلا مریض کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں۔

شاعری فکر اور فن کا امتزاج ہے۔ کوئی بھی شاعر ان میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں شاعر نہیں کہلا سکتا۔ انسان کی فکر اور تخیل خواہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو اگر وہ زبان و بیان پر دسترس نہیں رکھتا تو اچھی شاعری تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض زبان کی تکنیکی مہارت اور عروض پر عبور رکھنے والا فرد اگر فکر اور تخیل سے محروم ہے تو وہ ایک مشینی کاری گر تو کہلا سکتا ہے لیکن اس کا لکھا ہوا تاثیر اور شعریت سے عاری ہی ہو گا۔ گویا شاعر کا مشاہدہ اور تجربہ زبان اور اسلوب کے خوب صورت پیراہن کے بغیر کسی کام کا نہیں۔ جاوید انور کا شعری اسلوب منفرد اور دلچسپ ہے۔ ان کی نظمیں موضوعات کے مطابق اپنا لہجہ اور آہنگ پکڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے ہاں کئی لطیف احساسات کی حامل ہلکی پھلکی نظمیں بھی ملتی ہیں اور تلخ معاشرتی حالات کی عکاس بلند آہنگ نظمیں بھی نظر آتی ہیں۔ تاہم ہر دو صورت میں الفاظ کے چناؤ میں جاوید انور کو مہارت حاصل ہے۔

جاوید انور کے شعری سرمایے کو سمجھنے کے لیے یہ مقالہ ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ مقالہ میں سیاسی و سماجی پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے کے بعد جاوید انور کی نظموں کا اس تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ نظموں میں موجود سیاسی حوالوں کی تشریح کی گئی ہے اور مغربی استعماریت پر لکھی گئی نظمیں چن کر ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ سیاسی اور سماجی شعور جاوید انور کے فکر و فن کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس مقالے کے ذریعے ان کی شاعری کے اس پہلو کی تفہیم میں آسانی رہے گی۔ تاہم مختصراً جاوید انور کے شعری اسلوب پر بھی بات کی گئی ہے تا کہ ان کی نظموں کی فکری سطح کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ فنی سطح اور زبان و بیان کے خصائص کا بھی اندازہ ہو سکے۔

مصادر و مراجع

مصادر و مراجع

بنیادی مآخذ:

جاوید انور: ''شہر میں شام'' پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور، ۱۹۹۱ء

جاوید انور: ''اشکوں میں دھنک'' الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

جاوید انور: ''بھیڑیے سوئے نہیں'' قوسین پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء

جاوید انور: ''برزخ کے پھول'' القا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء

ثانوی مآخذ:

اعجاز حسین، ڈاکٹر: '' ادب اور ادیب'' اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۶۰ء

امجد طفیل، ڈاکٹر: '' ہم عصر اردو شاعری'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء

امجد طفیل، ڈاکٹر: ''ہم عصر اُردو شاعری'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء

انوار الحق حقی، سید، ڈاکٹر؛ ہاشم قدوائی (مرتبین): ''جدید سیاسی فکر'' ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء

ثاقب ندیم: (مضمون) ''سمندر ترے بادبانوں میں سویا ہوا ہے'' غیر مطبوعہ

رائے پوری، اختر حسین: ''ادب اور انقلاب'' ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد، (دکن) ۱۹۴۳ء

رشید امجد: '' شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، کوٹھی رتن چند، (رتن باغ)'' طیب اقبال پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۳ء

رشید امجد: ''شاعری کی سیاسی و فکری روایت'' دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳ء

سلمان صدیقی: ''جو نہ بجھ سکے ''تفصیلات ندارد، ص ۱۴۴، ۱۴۵

شاہد ماہلی: ''فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں'' اصلیہ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۱ء

طارق ہاشمی: ''جدید نظم کی تیسری جہت'' شمع بکس، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء

علی سردار جعفری: ''ترقی پسند ادب'' انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۲۰۱۳ء

فیض احمد فیض: '' دستِ صبا'' ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء

وزیر آغا، ڈاکٹر: '' تخلیقی عمل'' مکتبہ اردو زبان، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۷۰ء

وزیر آغا، ڈاکٹر: ''شام کی منڈیر سے'' مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۶ء

رسائل و جرائد:

''تسطیر'' جلد ۱۶، شمارہ: جنوری تا جون، ۲۰۱۲ء

"منزل" لکھنؤ، ۱۹۴۴ء

"فنون" شمارہ نمبر ۳۸، جنوری تا اپریل، لاہور

مقالہ جات:

سیف الرحمٰن: "جاوید انور: فن اور شخصیت" (مقالہ برائے ایم فل اُردو) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء

فرح عابد: "اُردو نظم کا فنی و فکری جائزہ" (مقالہ برائے ایم فل اُردو) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

مصاحبات:

فیاض انور برادر جاوید انور، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۴ نومبر ۲۰۲۳ء، وقت اڑھائی بجے دوپہر

ماریا زہرہ دختر جاوید انور، از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۵ نومبر ۲۰۲۳ء، وقت ۷:۱۳ بجے رات

وحید احمد، ڈاکٹر از راقمہ، بذریعہ موبائل فون، ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۳ء، وقت پانچ بجے شام

لغت:

شان الحق حقی: (مرتبہ) "فرہنگ تلفظ" مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۸ء